مضامینِ نہرو
آنند نرائن مُلّا
اردو اکادمی دہلی

# مضامینِ نہرو

(پنڈت نہرو کے انگریزی مضامین کا ترجمہ)

مترجم
آنند نرائن ملاّ

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی ۶۸



## تحقیقی واشاعتی کمیٹی کے ممبران

۱۔ جناب غلام ربانی تاباں (کنوینر)

۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم (ممبر)

۳۔ جناب جوگیندر پال (ممبر)

۴۔ ڈاکٹر شمیم حنفی (ممبر)

۵۔ جناب سید شریف الحسن نقوی (ممبر)

۶۔ جناب بی، ایس، گیرا (ممبر)

۷۔ پروفیسر اشتیاق عابدی (کوآرڈی نیٹر)

سنِ اشاعت : ۱۹۹۲ء

قیمت : ۴۰/- روپے

باہتمام : ڈاکٹر انتظار مرزا

طباعت : ثمر آفسیٹ پریس، کلاں محل نئی دہلی ۲

ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-7121-082-1

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی ۶۸



## تحقیقی واشاعتی کمیٹی کے ممبران

جناب غلام ربانی تاباں (کنوینر)
ڈاکٹر خلیق انجم (ممبر)
جناب جوگندر پال (ممبر)
جناب شمیم حنفی (ممبر)
جناب سید شریف الحسن نقوی (ممبر)
جناب بی۔ایس۔گیرا (ممبر)
پروفیسر اشتیاق عابدی (کوآرڈینیٹر)

MAZAMEEN-E-NEHRU Sept. 1992
TRANSLATED BY - ANAND NARAIN MULLA
RS. 40.00

سنِ اشاعت : ۱۹۹۲ء
قیمت : ۴۰/- روپے
باہتمام : شعبۂ طباعت واشاعت، اردو اکادمی، دہلی
طباعت : ثمر آفسیٹ پریس، کلاں محل نئی دہلی ۲
ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-7121-082-1

# فہرست

# حرفِ آغاز

دہلی ہندوستان کا دل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی روح، ثقافتی رنگارنگی اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ دہلی کلچر کے فروغ میں اردو نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اور آج بھی یہ زبان اس کی ادبی و تہذیبی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اردو کی کلچرل اہمیت اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے اس کے گہرے رشتے کے پیشِ نظر آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی، سابق وزیر اعظم مرکزی حکومتِ ہند کے ایما پر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی دہلی کا قیام عمل میں آیا۔

اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور طے شدہ دستور العمل ہے۔ دہلی کے لفٹننٹ گورنر اس کے صدر نشیں (چیرمین) ہیں اور اکادمی کے اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ ان اراکین میں ممتاز اہلِ قلم، ادیب، نقّاد، صحافی، معلّم اور محقق شامل ہیں۔ اکادمی دہلی اور بیرونِ دہلی دوسرے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی حلقوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہے اور اپنی سرگرمیوں میں ان کے تعاون اور مشوروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے اور کتاب کا مطالعہ اس کا شریف ترین مشغلہ، کتاب ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کا سب سے عمدہ وسیلہ ہے۔ اپنے اس بیش بہا ورثے کو محفوظ کرنا، اسے خوب تر اور مفید تر بنانا ہمارے تہذیبی فرائض کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ یہ گویا ادبی روشنیوں کو عام کرنا اور علمی خوشبوؤں کو پھیلانا ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے اسی کے تحت مذاکرے، سیمنار / ورکشاپ منعقد کیے اور ان میں پیش کیے جانے والے مقالات کو

کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ مختلف حضرات سے کتابیں تصنیف و ترتیب کرائی ہیں۔ مضامینِ نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اردو کے محترم بزرگ شاعر جناب آنند نرائن ملاّ صاحب نے اب سے بہت پہلے کیا تھا۔ کتاب اب نایاب ہے اس لیے اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس کی افادیت کے پیشِ نظر اُسے از سرِ نو شائع کیا جائے۔ ملاّ صاحب اپنی عمر کی دسویں دہائی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ان کے لیے اس پر تفصیلی نیا مقدمہ لکھنا مشکل تھا۔ اس لیے ان کے ارشادات کو جناب مخمور سعیدی صاحب نے قلمبند کر دیا ہے۔

اکادمی ملاّ صاحب کی ممنون ہے کہ انھوں نے وقت دیا اور اپنے ارشادات سے نوازا۔ جناب مخمور سعیدی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ ملاّ صاحب نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں اُن کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس کے لیے ہم فاضل مرتّب کی علمی کاوشوں کے ممنون ہیں اور اس تعاون کے بھی جو اشاعتی کمیٹی کی طرف سے ہمیں میسّر آتا ہے، اور ہمارے لیے روشنی و رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ و ادبیات سے متعلق کچھ ایسی اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھیں ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔

ہم اپنے موجودہ سرپرست اکادمی کے صدر نشیں جناب پی۔ کے۔ دوے لفٹننٹ گورنر دہلی کی عنایات اور توجہات کے بھی بے حد ممنون ہیں۔

**پروفیسر اشتیاق عابدی**

سکریٹری

اردو اکادمی، دہلی

# ایک اور کھینچی

پنڈت آنند نرائن ملّا اس وقت اردو کے بزرگ ترین شاعر ہیں۔ یہ بزرگی عمر کے لحاظ سے بھی ہے اور ان کے شاعرانہ مرتبے کے اعتبار سے بھی۔ ابھی کچھ ماہ قبل مدھیہ پردیش کی صوبائی حکومت نے ان کی شاعرانہ فتوحات کے اعتراف میں انھیں اپنا سب سے بڑا اعزاز اقبال سمّان پیش کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اہم سرکاری، اور غیر سرکاری، مرکزی اور صوبائی اداروں کی طرف سے ان کا اعزاز و اکرام ہوا ہے۔

ملّا صاحب ہندوستان کی اس گنگا جمنی تہذیب کا زندہ مرقع ہیں جس کا بہترین اظہار اردو زبان وادب میں ہوا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ملّا صاحب کے بے پناہ تعلق خاطر کا سبب بھی غالباً اس زبان کا یہی وصف ہے۔ آزاد ہندوستان میں اردو کے تحفظ و ترقی کی کوششوں میں ملّا صاحب نے جو قائدانہ کردار ادا کیا اس سے کون واقف نہیں؟

پنڈت جواہر لال نہرو کی تعلیم و تربیت انگریزی ماحول میں ہوئی لیکن ان کے خاندانی پس منظر میں مشرقیت رچی بسی تھی۔ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو ہندوستان کی اسی تہذیبی روایت کے پروردہ اور اس کے نگہدار تھے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ جواہر لال جی کی شادی کا دعوت نامہ انھوں نے اردو میں چھپوایا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور ملّا صاحب کے باہمی تعلقات کی اساس یوں تو ان کی خاندانی قرابت رہی ہوگی لیکن اس میں کچھ دخل اس ذہنی ہم آہنگی کو بھی رہا ہوگا جو ان دونوں کے درمیان ابتدا ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔ پنڈت نہرو کے منتخب انگریزی مضامین کا یہ ترجمہ جو کتابی صورت میں آپ کے پیشِ نظر ہے اسے پنڈت نہرو کے ساتھ ملّا صاحب کی اسی ذہنی قربت کی دین کہا جا سکتا ہے۔

یہ کتاب آج سے تقریباً ۵۰ سال قبل انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے شائع ہوئی تھی اور

اب برسوں سے نایاب تھی۔ خود ملّا صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ دہلی اردو اکادمی کی اشاعتی کمیٹی نے اس کی اشاعتِ ثانی کا فیصلہ کیا تو سوال اٹھا کہ کتاب کہاں سے دست یاب ہو آخر ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی ایک کاپی کہیں سے ڈھونڈ نکالی مگر اس کے کچھ اوراق کرم خوردہ تھے پھر ایک اور کاپی عظیم اللہ قریشی صاحب سے حاصل ہوئی جو صحیح حالت میں تھی۔ آئندہ صفحات میں اس کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔

مضامینِ نہرو کی اشاعتِ اول کا دیباچہ ملّا صاحب نے "بانس کی کھپچّی" کے عنوان سے بہت دلچسپ انداز میں تحریر کیا تھا۔ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب کی اہمیت اور افادیت کو بھی خاطر خواہ طور پر سامنے لے آتا ہے اس کی موجودگی میں کسی اور تحریر کی شمولیت ضروری نہیں تھی لیکن ملّا صاحب کے ایما پر مجھے یہ شرف بخشا گیا کہ اشاعتِ ثانی کا پیش لفظ میں تحریر کروں۔ یہ کام میرے لیے مشکل تھا لیکن ملّا صاحب کی حکم عدولی بھی آسان نہ تھی۔ میں نے طے کیا کہ اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے میں ملّا صاحب کو مصاحبے کی زحمت دوں اور وہ جو کچھ فرمائیں اسی کو قلمبند کر کے قارئین تک پہنچا دوں۔

چنانچہ ایک صبح وقت لے کر میں ملّا صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ میں کوٹھی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ملّا صاحب برآمدے میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ملّا صاحب کی نگاہیں کہیں دور خلاؤں میں کچھ کھوجنے لگیں جیسے عمر رفتہ کے گم شدہ لمحوں کے متلاشی ہوں۔ کہنے لگے: پنڈت نہرو جنھیں میں جواہر بھائی کہتا تھا، عمر میں مجھ سے ۱۱ سال بڑے تھے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت مجھ سے ایک سال بڑی تھیں۔ پنڈت نہرو کی طرح وہ بھی مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ دوسری بہن کرشنا ہتھی سنگھ مجھ سے چھوٹی تھیں۔ ہم مسز پنڈت کو سروپ اور کرشنا کو بٹی کہہ کر پکارتے تھے۔ اُن کے اور ہمارے خاندان میں آپس میں شادیاں بھی ہوئی ہیں۔ میری بہن شوراج وتی کی شادی نہرو جی کے کزن کشن لال نہرو سے اور دوسری بہن کیلاش وتی کی شادی نہرو جی کے موسیرے بھائی سے ہوئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں جب پنڈت نہرو، مسز پنڈت اور ان کے شوہر رنجیت پنڈت نینی جیل الٰہ آباد میں تھے تو مسز پنڈت اپنی لڑکیوں کو میری نگرانی میں چھوڑ کر گئی تھیں۔

ملّا صاحب بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئے اور ان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ

نمودار ہوئی۔ اس اثنا میں ملازمہ چائے لے آئی تھی دیگر لوازمات بھی تھے۔ ملّا صاحب نے چائے کی پیالی ہاتھ میں لی، ایک گھونٹ بھرا اور پھر بولے: ۱۹۲۵ء میں، میں نے لکھنؤ میں وکالت شروع کی تھی۔ نہرو جی کبھی لکھنؤ آتے تو میں انھیں اپنی بے بی آسٹن کار میں بٹھا کر شام کی سیر کے لیے لے جاتا۔ اسٹیشن روڈ پر مسز بخشی رہا کرتی تھیں۔ من موہن جی بھی وہیں رہتے تھے جو ہمارے اچھے واقفوں میں تھے ہم ان کے ہاں بھی چلے جاتے اور سیاست سے علم و ادب تک بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوتی ہم ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ نہرو جی میں استدلال کی زبردست قوت تھی۔ اختلاف کی صورت میں اکثر یہی ہوتا کہ ہم بالآخر ان دلیلوں کے سامنے سپر انداز ہو جاتے۔

ملّا صاحب نے پھر تھوڑا توقف کیا جیسے منتشر یادوں کو جمع کر رہے ہوں۔ مجھ سے کچھ کھانے کو کہا اور بولے: ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس کا سیشن ہوا۔ نہرو بہ حیثیت صدر مدعو کیے گئے اس موقع پر ہم نے ایک مشاعرہ رکھا۔ مشاعرہ کمیٹی کے سکریٹری این سلولوی تھے اور میں صدر تھا۔ مشاعرے کی صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی اور اس وقت کے تمام بڑے بڑے شعرا اس میں شریک ہوئے۔ مشاعرے کے ٹکٹ فروخت کیے گئے تھے، صرف یہی نہیں کہ جتنے ٹکٹ چھپوائے گئے تھے وہ سب فروخت ہو گئے بلکہ آخر میں ٹکٹوں کے کاؤنٹر فائل بھی ٹکٹوں کے طور پر لوگ خرید لے گئے اس مشاعرے کا مقصد کانگریس کے لیے فنڈ جمع کرنا تھا جو خاطر خواہ طور پر پورا ہوا مشاعرے میں میں نے اپنی نظم "جواہر لال نہرو" پڑھی جو بہت پسند کی گئی اور دوبارہ کانگریس کے کھلے اجلاس میں ساغر نظامی کی آواز میں پڑھوائی گئی جو بہت خوش الحان تھے۔

ملّا صاحب اب عمر کی دسویں دہائی میں ہیں۔ جسم کمزور ہو گیا ہے لیکن ان کے ذہن اور آواز پر بڑھاپا اثر انداز نہیں ہوا ہے۔ کہنے لگے: نہرو جی کو اردو سے بڑا لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی وہ اردو شعرا کی خدمت بھی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو مجھ سے ہی ایک شاعر کو دو سو روپے دلوائے تھے جو اس زمانے میں قابلِ لحاظ رقم تھی۔ لیکن مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو میں آپ کو سناتا ہوں۔ غالباً یہ ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے کانپور میں مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس زمانے میں بھی تحت اللفظ پڑھنے والوں کے مقابلے میں مترنم شاعروں کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ میری باری آئی اور میں اپنی نظم سنانے کھڑا ہوا تو مسز سروجنی نائیڈو نے کہا کہ ملّا تمھاری نظم ساغر نظامی پڑھیں گے۔ چنانچہ میری نظم "تم" جو ایک عاشقانہ نظم تھی ساغر نظامی نے ترنم سے پڑھی

اور یہ بہت زیادہ پسند کی گئی ۔ کچھ دن بعد الٰہ آباد میں مشاعرہ ہوا جس کی صدارت امرناتھ جھا نے کی۔ مشاعرے میں سروجنی نائیڈو بھی تھیں اور پنڈت نہرو بھی موجود تھے جو تازہ تازہ چین کے سفر سے لوٹے تھے اور وہیں کا چوغہ پہنے ہوئے تھے ۔ میں کچھ اور پڑھنا چاہتا تھا لیکن مسز سروجنی نائیڈو نے اصرار کیا کہ میں وہی کانپور کے مشاعرے والی اپنی نظم "تم" دوبارہ اس مشاعرے میں پڑھوں نظم میں نے پڑی لیکن یہاں اس کی کچھ زیادہ پزیرائی نہیں ہوئی بلکہ میں نے محسوس کیا کہ نظم سن کر پنڈت نہرو قدرے مکدر ہو گئے ہیں ۔ ہندی کے شاعر ہری ونش رائے بچن نے بھی اس مشاعرے میں اپنی ایک نظم پڑھی جس کا محوری مصرعہ تھا :

سیج پر کب تک رکوں میں آج موجوں کا نمنترن

یہ نظم لوگوں نے بہت پسند کی ۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد پنڈت نہرو نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا : اردو شاعروں کا حال عجیب ہے ، چہرے پر جھرّیاں پڑ جائیں گی ، جسم ضعیف ہو جائے گا مگر زبان ہائے دل ہائے دل پکارتی رہے گی ۔ دراصل مجھ سے انھیں یہ امید تھی کہ میں ان کی موجودگی میں وطن پرستانہ کلام سناؤں گا ۔

ملّا صاحب نے ایک گہری اور لمبی سانس لی اور بولے : پنڈت جی انگریزی کے شاعر رابرٹ فراسٹ کے بہت قائل تھے ۔ پنڈت جی کے انتقال کے بعد ان کے میز کی دراز سے رابرٹ فراسٹ کے چند قطعے بھی برآمد ہوئے تھے ۔ خیر اس وقت بھی انھوں نے مجھے اس کا ایک قطعہ سنایا اور کہا دیکھو! شاعری یہ ہوتی ہے تم اس کا اردو میں ترجمہ کرو ۔ میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی ۔ وہ ترجمہ یوں ہے ۔

مسکن ہے خاک میرا خود خاک سر بسر ہوں
دامِ حیات میں اک مرغِ شکستہ پر ہوں
پالا ہوا ہوں لیکن تاروں بھرے فلک کا
اس تیرہ خاکداں میں اک جلوۂ سحر ہوں
ہوں مشتِ خاک لیکن فردوس در نظر ہوں

ملّا صاحب کو ایک کے بعد ایک واقعہ یاد آرہا تھا ۔ کہنے لگے : فراق گورکھپوری جن کا نام رگھوپتی سہائے تھا ، پنڈت جی کے قریبی لوگوں میں تھے ۔ پنڈت جی ان کی شاعری کی وجہ سے بھی

ن کی قدر کرتے تھے اور اس جذبے کی وجہ سے بھی جو فراق صاحب کے دل میں آزادیِ وطن کے لیے موجزن تھا۔ ایک بار وہ پنڈت جی سے ملنے آنند بھون گئے اور ان کے نوکر سے کہلوایا کہ سہائے صاحب آئے ہیں۔ پنڈت جی باہر آئے تو دیکھا فراق ہیں، ہنسنے لگے اور بولے: آج تو سہائے بن کر آئے ہو، کل ایسا نہ ہو کہ ہائے بن کر آؤ۔ اس سے پنڈت جی کی حسِ مزاح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ملّا صاحب کہنے لگے: جو تراجم اس کتاب میں شامل ہیں، وہ سب پنڈت جی کے سنے ہوئے ہیں۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ جب ایک مضمون کا ترجمہ مکمل ہو جاتا تو میں پنڈت جی کو سنا لیتا پھر دوسرے مضمون کا ترجمہ شروع کرتا۔ جب میں نے جج کی ذہنیت کا ترجمہ پورا کیا تو پنڈت جی نینی جیل میں تھے۔ نینی جیل کے سپرنٹنڈنٹ کرنل اوبرائے تھے جو نہرو جی کی عزت کرتے تھے۔ جیل کے ضابطوں کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جو لوگ قیدیوں سے ملنے آئیں ان کی تلاشی لے کر اندر بھیجا جائے اور وہ باہر آئیں تو پھر تلاشی لی جائے۔ لیکن کرنل اوبرائے نے جن کا سلوک دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی اچھا تھا، پنڈت جی کے پاس آنے جانے والوں کو اس قاعدے سے مستثنیٰ کر رکھا تھا۔ کم از کم انھوں نے میری تلاشی کبھی نہیں لی۔ خیر میں ترجمہ لے کر جیل میں پہنچا اور پنڈت جی کو سنایا۔ مسز وجے لکشمی پنڈت کے شوہر رنجیت پنڈت بھی موجود تھے۔ پنڈت جی نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولے: یہ میرے مضمون کا ترجمہ مجھے اس طرح سنا رہے ہیں جیسے خود اپنا مضمون پڑھ رہے ہوں۔ پنڈت جی اس طرح شائستہ مذاق اکثر کیا کرتے تھے۔

ملّا صاحب بظاہر بے تکان بول رہے تھے مگر میں نے ان کے چہرے پر تھکن کے آثار دیکھے اور قطعِ کلام کی جسارت کرتے ہوئے ان سے پوچھا:

ملّا صاحب! انشا پردازی کے لحاظ سے تو یہ مضامین سدا بہار ہیں۔ بحالتِ موجودہ عملی نقطۂ نظر سے ان کی کیا قدر و قیمت ہے، کیا آپ اس بارے میں کچھ فرمائیں گے؟

ملّا صاحب چند لمحے خاموش رہے، جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں۔ پھر فرمایا: دنیا بڑی تیز رفتاری سے بدلی ہے۔ اُس زمانے میں جو خیالات ہمارے ذہنوں میں پرورش پا رہے تھے اور جو مقاصد ہمارے سامنے تھے وہ بھی بڑی حد تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ دنیا اور ہمارا ملک بھی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ افق در افق ہم ایک نیا سفر طے کر رہے ہیں اور اس سفر میں نسلِ انسانی کو کچھ نئی

مشکلات کا سامنا ہے۔ ان مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے جس دوربینی اور دوراندیشی کی ضرورت ہے اس سے یہ مضامین مملو ہیں اس لیے ان کی افادیت آج بھی ہے، کل بھی رہے گی۔

پنڈت جی کے طرزِ نگارش پر روشنی ڈالتے ہوئے ملّا صاحب نے فرمایا: ان کی زبان رسمی نہیں، تخلیقی ہے۔ وہ ایک صاف دل اور صاف گو انسان تھے۔ سیاسی لوگ عام طور پر نقاب پوش ہوتے ہیں لیکن پنڈت جی کی دلچسپی پردہ داری میں نہیں پردہ دری یا نقاب کشائی میں تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہیں تھے اور ان کی پوری زندگی ایک طرح کی نبرد آزمائی میں بسر ہوئی۔ ان کی تحریریں اسی نبرد آزمائی کی کہانی ہمیں سناتی ہیں۔ وہ اب بھی انگریزی زبان کے بڑے قلمکاروں میں ہیں لیکن اگر گاندھی جی سے متاثر ہو کر عملی سیاست سے وابستہ نہ ہو گئے ہوتے تو ان کے قلم سے اور بھی بیش بہا تحریریں معرضِ وجود میں آتیں اور ہماری روشن خیالی میں اضافے کا موجب بنتیں۔

ملّا صاحب کی اس مختصر مگر جامع گفتگو میں پنڈت جی کے ساتھ ان کے روابط کا ذکر بھی آگیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین کے بارے میں اظہارِ رائے بھی شامل ہے اور پنڈت جی کی تحریروں کی عمومی خصوصیات کا بیان بھی ـــــ اس گفتگو میں نے اپنے ذہن میں اور اکادمی کے اسٹینوگرافر محمد ہارون صاحب نے جو میرے ساتھ تھے، کاغذ پر نوٹ کیا تھا ان کے نوٹس سے گفتگو کو مرتب کرنے میں مجھے مدد ملی۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

مخمور سعیدی

۲۱ راگست ۱۹۹۲ء

# بانس کی کھپچّی

غالباً آخر ۱۹۳۶ء یا شروع ۱۹۳۷ء میں میرے دل میں پہلے پہل یہ بات آئی کہ میں پنڈت جواہرلال نہرو کے انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کردں۔ یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا اس کی چار وجہیں لوگوں کے ذہن میں آئیں گی۔

(۱) پنڈت جواہرلال نہرو سے میری ذاتی عقیدت۔

(۲) وہ انسانی کمزوری جس کی وجہ سے ہم کسی بڑے آدمی سے کسی قسم کی دور کی بھی نسبت پیدا کرلینا چاہتے ہیں تاکہ جس طرح ذرّہ سورج کی کرنوں میں چمکنے لگتا ہے اسی طرح ہم بھی اس بڑی ہستی کے عکس سے ایک حد تک جگمگا اٹھیں۔

(۳) تجارتی نقطۂ نظر یعنی یہ سمجھ کر کہ پنڈت جواہرلال کے مضامین کا ترجمہ چھاپنے والے اور خریدار دونوں آسانی سے مل جائیں گے اور کافی کتابیں بک جائیں گی۔

(۴) اپنی قابلیت کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا بے جا اظہار۔

ممکن ہے کہ لوگ اپنی اپنی جگہ پر ان میں سے کسی ایک وجہ سے مطمئن ہو جائیں اور یہ وجوہ شعوری یا غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں موجود بھی ہوں لیکن دراصل ان میں سے کوئی وجہ اس ترجمہ کی محرک نہیں۔ غالباً اس کتاب کو پڑھنے والے یہ اصرار نہ کریں گے کہ میں اصل وجہ بھی بتاؤں کیونکہ وہ میرے دل کی بات ہے اور مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اُسے اپنے دل میں ہی محفوظ رکھوں۔

(۲)

یہ کچھ دن تک اس خیال کو میں نے اپنے دل ہی میں رکھا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں فوراً پنڈت جواہرلال سے اس کی اجازت مانگوں۔ مجھ کو یہ اندازہ کرنا تھا کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہے بھی کہ نہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے میں نے سب میں پہلے WHITHER INDIA کا ترجمہ کیا۔ مجھے اس کے

ترجمہ کرنے میں قریب دو مہینے کے لگ گئے کیونکہ میں گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا اور ایک صفحے کا ترجمہ کرنے میں مجھے قریب قریب ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ ترجمہ تو میں نے کرلیا لیکن اب مجھے یہ فکر تھی کہ اگر میں اسی رفتار سے ترجمہ کروں گا تو غالباً کئی سال لگ جائیں گے۔ میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا اور یہ محسوس کیا کہ اگر کئی سال بھی لگ جائیں گے تب بھی میرا ارادہ قائم رہے گا۔ یہ جان کر میں نے ایک بار جب پنڈت جواہر لال لکھنو آئے اُن سے ڈرتے ڈرتے اس کا ذکر کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے منظور نہ کریں گے کیونکہ ان کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ترجمہ جامعہ والے کر چکے تھے۔ لیکن انھوں نے میری استدعا قبول کرلی اور مجھے اجازت دے دی کہ میں ان کے مضامین کا انتخاب کرکے ترجمہ کروں۔ انھوں نے مجھ سے یہ ضرور کہا کہ میں اس ترجمے کے شائع کرنے کے لیے "جامعہ دہلی" سے خط و کتابت کروں۔ میں نے جامعہ والوں کو لکھا اور اس میں سب واقعات مفصّل لکھ دیے۔ انھوں نے شائع کرنے کی رضامندی ظاہر کی لیکن یہ تحریر فرمایا کہ میں اپنے ترجمے کا ایک جزو نمونے کے طور پر ان کے پاس بھیج دوں۔ اصولی اعتبار سے جامعہ والوں کا یہ مطالبہ محض جائز ہی نہیں تھا بلکہ صحیح تھا لیکن میرے دل کو یہ بات خواہ مخواہ ناگوار گزری۔ اس کے علاوہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ ترجمہ جامعہ میں شائع ہوگا تو میں خود پروف کی تصحیح نہ کرسکوں گا۔ اس وجہ سے میں نے انڈین پریس الٰہ آباد کو جو میری مرتبہ کتاب " یادِ چکبست " حال ہی میں شائع کر چکے تھے لکھا۔ انھوں نے میری سب باتیں منظور کرلیں اور اس کتاب کو علی حسین کاتب لکھنو ہی میں لکھنے لگے۔

(۳)

کتاب لکھنا تو شروع ہوگئی لیکن میری فطری کاہلی یا ترجمہ کی مشکلوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک آگئی کہ آئے دن نوکر باہر سے آکر اطلاع دیتا "حضور! علی حسین آئے ہیں" اور میں جواب دیتا تھا " ان سے کہو پرسوں آئیں " اور اس طرح پانچ سات پرسوں ٹلنے کے بعد علی حسین کو کچھ صفحات مل جاتے تھے۔ علی حسین نے زبان سے تو کبھی کچھ نہیں کہا لیکن غالباً وہ میرے 'پرسوں' کے معنی بخوبی سمجھنے لگے تھے اور میں بغیر ان کے کچھ کہے ان کی خاموش مسکراہٹ دیکھ کر دل ہی دل میں نادم ہوتا تھا ظاہر ہے یہ اندازِ گفتگو کب تک چل سکتا تھا، چنانچہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں کسی ترجمے میں ہاتھ بٹانے کے لیے اپنا شریک کرلوں۔ میں نے سید احتشام حسین صاحب مالی سے جو لکھنو یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار ہیں درخواست کی کہ وہ مجھے کچھ مدد دیں۔ وہ بےچارے مروت کے مارے انکار نہ کر سکے اور میں نے ان کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس مجموعے میں (۱) " ترین میں "

(۲) "اپنے دوستوں اور نکتہ چینوں سے" (۳) "تامل ناد کو خیر باد کہتے وقت" (۴) "کانگریس اور اشتراکیت" اور (۵) "پیامات۔ انتخاب کے موقع پر"۔

یہ پانچ مضامین انھیں کے ترجمہ کیے ہوئے ہیں۔ اُن کے اس اخلاص نے جو جذبات میرے دل میں پیدا کیے ہیں وہ باوجود اس اعتراف کے تشنۂ اظہار ہیں۔

(۴)

میں نے اوپر ترجمہ کی مشکلوں کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جو دشواریاں مجھے شروع شروع میں پیش آئی تھیں وہ آگے چل کر جب مجھے ترجمہ کرنے کی عادت ہو جائے گی باقی نہ رہیں گی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا اور آخر وقت تک مجھے انھیں مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اردو زبان پر مجھے کافی عبور نہیں۔ مجھے تو ہر جملے پر کافی دیر تک اٹکنا پڑتا تھا اور جس طرح کوئی امتحان کا پرچہ کرتا ہے اس طرح میں نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ قدم قدم پر مجھے اردو کی 'کوتاہیٔ داماں' کا احساس ہوتا تھا اور کچھ دیر کے لیے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس خیال کا اظہار اردو میں ناممکن ہے لیکن کسی نہ کسی طرح ترجمہ ہو ہی جاتا تھا اور میں آگے بڑھتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ احتشام صاحب پر کیا بیتی لیکن جس رفتار سے انھوں نے ترجمہ کیا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس منزل میں ان کا سبک پا خامہ بھی اپنی معمولی چوکڑیاں بھول گیا اور میرے قلم سے کچھ زیادہ تیز چال نہ چل سکا۔

(۵)

یہ بات قابلِ افسوس ضرور ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ احتشام صاحب کی شست روی دیکھ کر مجھے ایک خاص طرح کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ مجھے کسی قدر یہ اطمینان ہوتا تھا کہ محض میری بے بضاعتی ہی ترجمے کی مشکلوں کی وجہ نہیں بلکہ ایک حد تک پنڈت جواہر لال کی طرزِ تحریر بھی اس کی ذمہ دار ہے کسی صاحبِ طرز کے مضامین کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان نہیں جس کسی نے پنڈت جی کے تھوڑے سے بھی انگریزی مضامین پڑھے ہوں گے اس کے دل پر ان کی طرزِ نگارش کی تین خصوصیتیں ضرور نقش ہو گئی ہوں گی۔ سب سے پہلی خصوصیت ان کی ذہنی رفعت ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے سوال کو وہ ایک حکیمانہ انداز میں حل کرتے ہیں اور اُسے جدوجہدِ انسانی کا پس منظر دے کر پیش کرتے ہیں۔ چونکہ انھیں انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہے اس لیے وہ زندگی اور سماج کے تمام مسائل کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں اس خوبی اور آسانی سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تو اس کا حس نہیں ہوتا لیکن ترجمہ کرنے والے کا دل ہی جانتا ہے۔ اور چونکہ انھیں اپنے مخاطب کے شکوک رفع کرنے ہوتے ہیں

لہٰذا وہ قدم قدم پر دل و دماغ کا جائزہ لیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ وہ خیال کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں جن کی ترجمانی کرتے وقت معمولی انسانوں کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ ان کی طرزِ نگارش کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر موضوع زیرِ بحث میں اپنے ذاتی تاثرات اس انداز سے شامل کر دیتے ہیں کہ ان کا ہر مضمون بجائے ایک خشک علمی مباحثے کے ایک زندہ سوال بن کر سامنے آتا ہے اور پڑھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی جواب دے۔ پنڈت جواہر لال کے دل و دماغ دونوں مشتعل ہیں اور ان کے مضامین میں ان کے خیالات اور جذبات اس خوبی سے سموئے ہوئے ہیں کہ ان کی نثر پر نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی باتیں لکھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی اپنا ذاتی نفسیاتی تجربہ بیان کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ الفاظ اس سلیقے سے انتخاب کرتے ہیں کہ اظہارِ مفاہیم میں ایک برجستگی پیدا ہو جاتی ہے جو پڑھنے والوں کے دل میں نشتر کی طرح اتر جاتی ہے۔ تیسری خصوصیت جس کا دراصل تعلق ان کی ذات سے ہے وہ ان کی حیرت انگیز بشریت ہے' (میں نے انسانیت کہنے سے جان بوجھ کر گریز کیا ہے کیونکہ بے جا استعمال کی کثرت سے انسانیت محض چند خشک نیکیوں کے مجموعے کا نام ہو کر رہ گئی ہے جس کی نہ میرے دل میں کوئی قدر ہے اور نہ عظمت)۔ اس بشریت نے ابھی تک اور سیاسی رہنماؤں کی طرح ان کے دماغ کی برودت کو ان کے دل کی حرارت پر غالب آنے نہیں دیا ہے۔ یہی بشریت ہے جس نے انھیں ایک خدائی فوجدار بنا رکھا ہے۔ جو ہر زبردست کے خلاف ہو کر زیردست کی طرف سے انھیں آواز بلند کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جو غم کی تاریک سے تاریک رات میں یاس و حرماں میں ڈوبے ہوئے دلوں کو بھی ایک نکلنے والے آفتاب کی کرن بن کر امید اور زندگی کا پیام دیتی ہے۔ اس بشریت نے ان کی طرزِ تحریر میں ایک عجیب و غریب شگفتگی اور شوخی پیدا کر دی ہے جسے جیل خانے کی اونچی دیواریں بھی دبا نہیں سکتیں اور جس کی ترجمانی کرنا میرے ایسے ترجمہ کرنے والے کے بس کی بات نہیں۔

(۶)

میں نے ان خصوصیتوں کا ذکر محض اس غرض سے کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ترجمے کی مشکلوں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ پھر بھی اپنی بساط بھر میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ لکھنے والے کا کوئی نازک سے نازک مفہوم اور لطیف سے لطیف اشارہ ضائع نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی روانی قائم رہے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ ایک ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چند مقامات پر جہاں پنڈت جی نے اپنے مضامین میں انگریزی نظموں کے کچھ حصے شامل کیے ہیں

میں نے بھی اپنے زعم میں ان کا ترجمہ اردو نظم ہی میں کیا ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ میں اپنی رائے خود ظاہر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ غیر جانب دار نہیں کہی جا سکتی۔

جن مضامین کو اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے وہ ان کتابوں سے لیے گئے ہیں۔

(۱) RECENT ESSAYS AND WRITINGS

(۲) EIGHTEEN MONTHS IN INDIA

(۳) INDIA AND THE WORLD

یوں تو پنڈت جواہر لال ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں اور ان کے تمام مضامین کا ترجمہ کرنا کم سے کم میرے لیے ایک ناممکن بات ہے کیونکہ نہ تو میرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ اتنی قابلیت کہ جس تیزی سے وہ لکھتے ہیں اسی تیزی سے ان مضامین کا ترجمہ کر سکوں۔ اس کے علاوہ اگر ان سب کا ترجمہ کیا جاتا تو کئی جلدوں کی نوبت آجاتی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ صرف چند مضامین کا انتخاب کر کے ترجمہ کیا جائے۔ انتخاب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا کیونکہ ان کے ہر مضمون میں ایک دلکشی ہے اور پڑھنے والے کے دل و دماغ کے لیے ایک خاص پیام۔ ایسی صورت میں انتخاب کرتے وقت میں نے دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اول تو میں نے وہ مضامین انتخاب کیے ہیں جو میری رائے میں ان کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں جن میں انھوں نے ہماری سیاسی یا اقتصادی زندگی کے اہم سوالات کا حل پیش کیا ہے اور پس پردہ کام کرنے والی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ہم ان کی رائے مانیں یا نہ مانیں۔ انھیں نتیجوں پر خود پہنچیں یا نہ پہنچیں۔ لیکن یہ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو حل وہ پیش کرتے ہیں وہ ایک مخصوص نظریہ کی بہترین ترجمانی پیش کرتا ہے اور ہمارے لیے ان کی دلیلوں کا جواب دینا آسان نہیں۔ دوسرے وہ مضامین ہیں جن میں انھوں نے کسی قدر اپنی ذات کو نمایاں کیا ہے اور ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم ایک حد تک ان کے قریب پہنچ سکیں۔ انھیں پڑھ کر ہمیں ان کی ذاتی کشش کا احساس ہوتا ہے اور وہ ہمارے ذہنی احترام کی حدوں سے کہیں آگے بڑھ کر ہمارے دلوں میں بھی اپنا گھر کر لیتے ہیں۔ وہ محض ہمارے سیاسی رہنما ہی نہیں رہتے بلکہ ایک ایسے رفیق بن جاتے ہیں جس سے ہم زندگی کے دکھ سکھ میں ایک ہم آہنگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

(۸)

غالباً میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ مضامین نہرو کسی تعارف

کے محتاج نہیں۔ روئے زمین کے ہر حصّے میں یہ پڑھے جا چکے ہیں اور مظلوم اور مایوس انسانیت ان سے شمعِ ہدایت کا کام لے رہی ہے لیکن اس رسم زدہ دنیا کو کیا کیا جائے؟۔ پریس والوں کی ضد ہے کہ جب تک میں چند سطریں بطور تمہید کے نہ لکھوں گا وہ کتاب شائع نہ کریں گے ۔ باغوں میں اکثر لہلہاتے ہوئے پھولوں کے تختوں میں ایک بانس کی کھپچّی لگی ہوتی ہے ۔ ایک موٹے کاغذ کا چھوٹا سا چوکور ٹکڑا اس کھپچی میں بندھا ہوتا ہے جس پر ان پھولوں کی قسم اور نام لکھا ہوتا ہے۔ پھولوں کے شیدائی جو اس باغ میں آتے ہیں وہ بھول کر بھی اس کھپچّی پر نظر نہیں ڈالتے۔ لیکن باغ کی رسم کا یہی تقاضہ ہے کہ وہ کھپچّی ضرور لگائی جائے ۔ مالی کی اس ستم ظریفی سے اس کھپچّی کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا میں اس وقت بخوبی اندازہ کرسکتا ہوں۔

(۹)

مجھے جو لکھنا تھا میں لکھ چکا اور میں سمجھا تھا کہ اب میں نے فراغت پائی لیکن علی حسین اب بھی اطمینان سے دم لینے نہیں دیتے ۔ فرما رہے ہیں کہ ابھی دوسری جلد باقی ہے ۔ خیر دیکھا جائے گا۔

آنند نرائن ملّا

۳۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء

# ہندوستان کدھر؟

جیل خانے سے تازہ چھوٹا ہوا قیدی زندگی اور سیاست کی کشمکش اور سختیوں سے ایک عرصہ سے کنارہ کش تو ضرور رہتا ہے لیکن اسی وجہ سے اس کو ایک قسم کی فوقیت بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ ایک بیگانہ وار نظر ڈال سکتا ہے۔ وہ وقتی اختلافات میں اتنا محو نہیں ہوجاتا ہے جس وقت کہ اور لوگ حکمتِ عملی کی ادنیٰ مصلحتوں میں الجھے ہوتے ہیں وہ اصولوں پر نظر جما سکتا ہے۔ اس کو کچھ وہ حقیقتیں بھی نظر آجاتی ہیں جو ہر وقت بدلنے والے مظاہرات کی تہہ میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ جو لوگ کہ اس کا جواب دے سکتے ہیں ان میں سے زیادہ تر یا تو جیل خانوں میں بند ہیں یا ان کے منہ سی دیے گئے ہیں لیکن (ہمارے حکام اور ان کے وفادار خدام ہم کو مخلصانہ مشورہ جس میں دھمکیوں کا بھی پہلو ہوتا ہے برابر مفت دیے چلے جارہے ہیں) وہ کبھی ہم کو آگاہ کرتے ہیں، کبھی ڈراتے ہیں، کبھی سمجھاتے ہیں اور کبھی بہلانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ابھی وہ یہ طے نہیں کرسکے ہیں کہ ہمارے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے کون سا طریقہ سب میں زیادہ مناسب اور کارگر ثابت ہوگا۔ آئیے تھوڑی دیر کے لیے ہم ان کو اور ان کے مشوروں کو بھول جائیں۔ کیونکہ ایسے تحفے اگر مفت بھی ملیں تو مشکوک ہیں۔

صحیح طرزِ عمل بغیر غور و فکر کیے ہوئے یکایک پیدا نہیں ہوسکتا جو خیال کرسعی میں تبدیل نہ ہو وہ ناقص اور نامکمل ہے، جو سعی کہ فکر کا نتیجہ نہیں وہ بے ترتیب اور لاحاصل ہے بہتر یہی ہے کہ ہم ان تمام الجھے ہوئے جالوں کو جو کہ ہمارے دماغوں میں لگے ہوئے ہیں نوچ کر پھینک دیں) موجودہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش نہ کریں اور تھوڑی دیر کے لیے موجودہ مشکلات

اور آئے دن کی پریشانیوں کو بھول کر اپنی نظر بنیادی باتوں اور اصولوں کی طرف لے جائیں۔
چونکہ قومی اخباروں پر ایک مدت سے میری نظر نہیں پڑی ہے لہٰذا میں اس مسئلہ پر کچھ کہتے ہوئے ایک ہچکچاہٹ سی محسوس کرتا ہوں لیکن میرا دل یہی کہتا ہے کہ ان بنیادی باتوں اور اصولوں پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ محتسبِ اشاعت کا حکم یا خوف ایک حد تک اس کا ذمہ دار ہو لیکن میرے نزدیک یہ کافی وجہ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو وائسرائے سے ملنا چاہیے یا نہیں ؛ اسٹینلے بالڈون STANLEY BALDWIN جیتنگے یا ونسٹن چرچل WINSTON CHURCHILL, سر سیمول ہور SIR SAMVEL HOARE نے کیا کیا یا کیا نہیں کیا ! کیا ہم کو وہ عجیب وغریب چیز یعنی وسطی ذمہ داری ملے گی کہ نہیں، یہی باتیں ہماری نظر کے سامنے رہتی ہیں اور اپنے مقصد اور اصلی نزاع کی طرف بھولے سے بھی خیال نہیں جاتا۔
اپنی تمام عمر میں دنیا کی وہ غیر مستقل حالت کبھی نہیں رہی جیسی کہ آج ہے۔ آج تک دنیا نے اس طرح اپنے دل کا جائزہ نہیں لیا۔ اور نہ ایسے شکوک اور شبہات پیدا ہوئے، جن سے اس کا دماغ چکرا جائے۔ کبھی اس طرح پرانے نظام کو جانچنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ کبھی اس طرح موجودہ خرابیوں پر اور ان کے دور کرنے کی تدبیروں پر غور کیا۔ دنیا کی سطح پر ایک مسلسل انقلابی لہر دوڑتی چلی جا رہی ہے اور ہر ملک کے فکرمند مدبر جن کی عقلیں قریب قریب جواب دے چکی ہیں۔ اس کے اسباب اندھوں کی طرح اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم بھی دنیا سے کچھ علیحدہ نہیں، اور دنیاوی واقعات سے متاثر ہونا بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔ لیکن جس بے حسی سے ہم ہندوستان میں ان باتوں پر توجہ دیتے ہیں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے ہم سے ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اخباروں میں اہم واقعات شائع ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی پس پردہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ یہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوئے کوئی سمجھنا نہیں چاہتا ہے کہ وہ کون طاقتیں ہیں جو دنیا کو ہلائے ہوئی ہیں۔ اور ہماری آنکھ کے سامنے اس کی شکل تبدیل کر رہی ہیں۔ اور نہ کوئی اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ تاریخ چاہے وہ گزشتہ ہو، یا موجودہ،

ہماری نظروں میں محض ایک جادو کا تماشہ بنی ہوئی ہے ۔ جس میں کسی واقعہ کے لیے کوئی وجہ یا سبب نہیں ہے ۔ اور نہ جس سے آئندہ کی منزلیں طے کرنے میں ہمیں کوئی سبق حاصل کرنا ہے ۔ ہندوستان اور انگلستان کی آراستہ اور نمائشی اسٹیج پر چند کٹھ پتلیاں تھوڑی دیر کے لیے مدبرانہ صورت بنا کر چل پھر رہی ہیں ۔(گول میز کے موکل جن میں کہ ان کے بنانے والوں کے خدوخال دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں، ایک فضول اور لا متناہی بحث میں جس میں نہ کسی کو دلچسپی ہے اور جس کا نہ کسی پر اثر ہے، الجھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کی ساری فکر یہی ہے کہ کسی مخصوص گروہ یا طبقے کے حاصل شدہ حقوق کی پاسداری کس طرح کی جائے ۔ اور پلاؤ قورمہ اڑانے کے علاوہ ان کی سب میں بڑی تفریح خود ستائی ہے ۔)

کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو اپنی معصومیت اور بھولے پن سے پچھلے سال کے تمام وقعات بھلائے بیٹھے ہیں اور ابھی تک ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں ۔ اور جب کوئی ان کی باتیں سننے کو تیار نہیں ہوتا تو انھیں تعجب بھی ہوتا ہے اور غصّہ بھی چڑھتا ہے ۔ (رفتار زمانہ، جنگ عظیم اور انقلاب) دنیا کی پے در پے اور سنگین ضربیں بھی ان کی پتھریلی کھوپڑیوں پر کسی قسم کی خفیف سے خفیف خراش ڈالنے میں ناکامیاب رہی ہیں) چند ایسے ہیں جو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد، فرقہ بندی اور قومیت کے پردے میں چھپائے ہوئے ہیں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے دل میں ایک موہوم قوم پرستی کا جذبہ ہے ۔ جو موجودہ حالت سے بیزار ہیں ۔ اور بغیر صاف طور پر یہ سمجھے ہوئے کہ آزادی کیا شکل اختیار کرے گی قومی آزادی کے طلبگار ہیں ۔ ان کے علاوہ وہ تمام کیفیات جو قومیت کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں دیگر ملکوں کی طرح یہاں بھی نظر آتی ہیں ۔ مثلاً ایک مقصد پرستی، ایک روحانیت، ایک وجدانی کیف، ایک ملک کے پیام میں دل سے یقین اور ایک قسم کے مذہبی جوش کی تجدید ۔ دراصل یہ سب درمیانی طبقے کے ذہنی تاثر کے مظاہرات ہیں ۔

ہماری سیاست کو یا تو جادو کا کھیل ہونا چاہیے، یا اس کی بنا کسی اصول اور حکمت پر قائم ہونی چاہئے ۔ پہلی بات میں تو ظاہر ہے کہ نہ منطق کا دخل ہے اور نہ کسی بحث کی ضرورت ۔ لیکن دوسری بات کم سے کم تخیلی حیثیت سے پورے طور پر عقل کی صاف بینی اور واقعات

سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی قابلیت پر مبنی ہے۔ اُن موہوم اصولوں کی جن سے دماغ پریشان ہو جائے یا نظر دھندلی پڑ جائے، چاہے وہ کتنے ہی تابع مقصد پرستی کیوں نہ ہوں، یا ان کی بنا مذہب اور احساسات ہی پر قایم کیوں نہ ہو، اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ذاتی طور پر جادو اور مذہب کے طریقوں پر نہ تو مجھے بھروسہ ہے اور نہ میں انھیں کارآمد سمجھتا ہوں۔ میں تو اس معاملے پر محض حکیمانہ اصول سے روشنی ڈال سکتا ہوں۔

ہاں تو پھر ہم کیا چاہتے ہیں۔ آزادی! سوراج! خود مختاری! ڈومنین اسٹیٹس DOMINION STATUS یہ سب الفاظ ہیں جن کے بہت کچھ معنی ہو سکتے ہیں اور کچھ بھی معنی نہیں۔ مصر آج خود مختار ہے اور پھر بھی جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے اس کی موجودہ حالت ایک دیسی ریاست سے کچھ ہی بہتر ہے۔ ایک قوم پر اس کی مرضی کے خلاف برطانوی مدد سے ایک غیر ذمّہ دارانہ شخصی حکومت قائم کی گئی ہے۔ اقتصادی حیثیت سے مصر کو یورپ کی چند سامراجی طاقتوں کی خصوصاً برطانیہ کی نوآبادی سمجھنا چاہیے۔ جنگ عظیم کے زمانے سے مصر کی قومیت میں اور اس کی حکمراں طاقت میں برابر پرخاش رہی اور یہ آج تک جاری ہے۔ اس طرح باوجود خود مختار کہلانے کے مصر کو ابھی قومی آزادی تک نصیب نہیں ہے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کی آزادی کے لیے ہم خاص طور پر کوشاں ہیں کیونکہ قومیت ایک وسیع لفظ ہے اور ایسے عناصر کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ والیانِ ملک بڑے اور چھوٹے زمیندار، پیشہ ور طبقہ، کسان، اہلِ حرفہ و تجارت، ساہوکار، معمولی حیثیت کے آدمی، غریب اور مزدور سب ہی اس کے اجزا ہیں۔ اس میں ہندوستانی اور ولایتی سرمایہ دار دیسی اور پردیسی اہلکار سب کی اغراض شامل ہیں۔ قوم پرست اس سوال کا اس سے زیادہ جواب نہیں دیتے کہ ہم دیسی اغراض کو پردیسی اغراض پر ترجیح دیں گے۔ وہ موجودہ سماجی نظام اور طبقہ وارانہ تفریق کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے۔ وہ یہ سوچ لیتے ہیں کہ جب ملک آزاد ہو جائے گا تو کسی نہ کسی طرح ان تمام مختلف اغراض میں ایک طرح کا سمجھوتہ ہو جائے گا۔ قوم پرستی چونکہ دراصل درمیانی طبقہ کی تحریک ہے اس واسطے اس طبقہ کی اغراض خاص طور پر نظر کے سامنے رکھتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان مختلف اغراض میں ایک دوسرے سے

سخت مخالفت ہے اور ہر قانون یا طرزِ حکومت جو ایک کے لیے مفید ہے وہ دوسرے کے لیے مضر ہے۔ جو بات کہ کسی والیِ ملک کو پسند ہو اس کی رعایا کو ناگوار ہو سکتی ہے۔ جو چیز کہ زمیندار کے لیے مفید ہے اس کے کاشتکاروں کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ جو آئین کہ پردیسی سرمایہ کے مطالبات پورے کرے گا وہ ملک کی کمزور حرفتوں کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔

اس سے زیادہ مہمل کوئی خیال نہیں کہ قوم کے تمام اغراض بغیر کسی کی دل آزاری کیے ہوئے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ ہر قدم پر ایک کے لیے دوسرے کو بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے۔ کرنسی کا آئین قرض خواہ اور مقروض دونوں کو ایک وقت میں فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ روپے کی قیمت اگر گھٹا دی جائے تو مقروض یقیناً خوش ہوں گے کیونکہ ان کے قرضے یا تو سٹ جائیں گے یا نام کو رہ جائیں گے اور اہلِ حرفت بھی عام طور پر اسے پسند کریں گے لیکن مہاجن اور ساہوکار یا وہ لوگ جن کی آمدنی مستقل ہے ان کی ناراضگی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان نے جان بوجھ کر اپنے اہلِ زراعت کو اپنے اہلِ حرفت پر قربان کر دیا۔ ابھی چند سال کی بات ہے ۱۹۲۵ء میں پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت قائم رکھ کر اس نے کسی حد تک اپنے اہلِ حرفت کو اپنے مہاجنی اصول اور ساہوکارانہ نظام کے بھینٹ چڑھا دیا اور یہی وجہ تھی کہ مزدوروں میں اتنی ہلچل مچی اور اتنی بڑی ہڑتال ہوئی۔

ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ تو بااختیار طبقے کے دو مختلف گروہوں کے مخالفانہ مقاصد کی نظیریں ہیں۔

اغراض کی اس سے بھی زیادہ سنگین لڑائی اس وقت ہوئی ہے جبکہ بااختیار طبقہ مجموعی حیثیت سے باقیماندہ افراد کے خلاف محاذ تیار کرتا ہے جبکہ وہ جنگ ہوتی ہے جس میں برسرِ کار ایک طرف اور بے کار دوسری طرف ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بخوبی ظاہر ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے چاہے وہ سیاسی ہو یا اقتصادی وہ ہر امکانی کوشش کرتے ہیں کہ اصل نزاع پر لوگوں کی نظر نہ جائے۔ حکومتِ برطانیہ خدا کو حاضر و ناظر بنا کر زبان سے برابر یہی کہے چلی جا رہی ہے کہ اس ملک کے بے زبان باشندوں کی وہی ولی ہے اور

انگلستان اور ہندوستان کی اغراض مشترک ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ایک مشترک منزلِ مقصود تک جاسکتے ہیں۔ ان باتوں میں صرف چند ہی آدمی آسکتے ہیں کیونکہ قومیت ہم کو اتنا ضرور بتاتی ہے کہ ہمارے اور برطانوی اغراض میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہی قومیت ہم کو اس فطری اور اصولی اختلاف کے سمجھانے میں جو کہ ملک کی مختلف اقتصادی اغراض میں ہے کوتاہی کرتی ہے۔ اس اختلاف کو ہمیشہ یہ کہہ کر کہ قومی آزادی کا مسئلہ پہلے طے ہونا چاہیے دبانے کی اور چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے ہمیشہ مختلف طبقوں اور گروہوں سے مشترکہ قومی دشمن کے خلاف متفق اور متحد ہونے کی التجا کی جاتی ہے اور جو لوگ کہ زمیندار اور کاشتکار اور مزدور اور سرمایہ دار کی فطری مخالفت دکھانا چاہتے ہیں وہ اعتراض کر کے خاموش کر دیے جاتے ہیں۔

ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ عام طور پر کوئی آدمی لڑائی جھگڑا یا مسلسل کشیدگی پسند نہیں کرتا۔ وہ صلح اور سکون چاہتا ہے اور اس کے لیے بہت کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن۔ ایک ایسی لڑائی اور بدنظمی کی طرف سے جان بوجھ کر آنکھیں پھیر لینا جو محض موجود ہی نہیں بلکہ جو ہمارے سماجی نظام کی جڑ کھودے ڈال رہی ہے کوئی دانائی نہیں اور اس کا نتیجہ یقیناً تباہی ہے۔ اس طرح نہ تو یہ کشاکش دور ہو سکتی ہے اور نہ آنکھیں بند کرنے سے حقیقت مجاز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو بھول نہ جائیں اور اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے آزادی کے خیال کو تشکیل دیں۔ ہم کو اس سوال کا جواب کہ ہم کس جماعت یا کن جماعتوں کی آزادی کے لیے خاص طور پر سرگرم ہیں ضرور دینا پڑے گا۔ ہم اس کا جواب دینے سے بچ نہیں سکتے۔ آج نہیں تو کل جواب دینا ہوگا۔ کیا ہم کاشتکاروں اور مزدوروں کے جمِ غفیر کو اپنی فہرست میں سب سے پہلی جگہ دیتے ہیں یا کسی دوسری چھوٹی جماعت کو؟ ہم جتنے بھی گروہوں یا جماعتوں کو آزادی کی نعمت دے سکیں ضرور دیں لیکن یہ نہ بھول جائیں کہ دراصل ہم کس کے طرفدار ہیں اور اگر ان گروہوں کی اغراض میں اختلاف پیدا ہوا تو ہم کو کس کا ساتھ دینا ہے! یہ کہنا کہ ہم اس سوال کا جواب نہیں دیں گے یہ بھی اک جواب ہے کیونکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم موجودہ نظام کی برقراری کے حامی ہیں۔

حکومت کی ظاہری صورت تو بالآخر مقصد براری کا محض ایک طریقہ ہے اور یوں تو آزادی خود ایک ذریعہ ہے جس کا مقصد انسانی بہتری اور انسانی ترقی جس کا نصب العین افلاس بیماری اور مصیبت کو دور کرنا ہے اور ہر انسان کو جسمانی، دماغی اور روحانی اعتبار سے ایک اچھی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔ اچھی زندگی کی کیا تعریف ہے یہ یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن اس بات پر زیادہ لوگ متفق ہوں گے کہ اس کے لیے آزادی لازمی ہے۔ قوم کے لیے قومی آزادی اور فرد کے لیے شخصی آزادی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر قسم کی رکاوٹ یا بندش ترقی کی دشمن ہے اور اقتصادی بدنظمیوں کے علاوہ یہ قوم اور فرد دونوں کی طبیعت اور ذہنیت پر بُرا اثر ڈالتی ہے اور مختلف قسم کی بدمزاجیاں یا غیر فطری رجحانات پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا آزادی تو ضروری ہے۔ لیکن معاونت کی اہلیت اور خواہش بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ موجودہ زندگی اتنی پیچ در پیچ ہے اور اس کا دارومدار اس قدر ایک دوسرے پر ہے کہ محض تعاون کی برکت ہے کہ آج اس کے جسم میں روح نظر آتی ہے۔

تاریخ کے صفحات میں ہم کو مختلف اقسام کے طرزِ حکومت کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے، اور نظام سلطنت اور پیداوار کے تبدیل ہوتے ہوئے اقتصادی طریقے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ جب اقتصادی تبدیلی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے اور طرزِ حکومت اپنی جگہ پر قریب قریب غیر متحرک رہ جاتی ہے تو دونوں کے بیچ میں ایک کھائی پیدا ہو جاتی ہے جس کو صرف ایک انقلاب پاٹ سکتا ہے تاریخ اور طرزِ حکومت کی تشکیل میں جو زبردست اہمیت اقتصادی معاملات کی ہے اس سے آج کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

ہم کو اکثر بتایا جاتا ہے کہ مشرق اور مغرب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مغرب کو مادہ پرست کہا جاتا ہے۔ اور مشرق کو روحانیت اور مذہبیت کا گہوارہ قرار دیا جاتا ہے۔ لفظ مشرق سے دراصل کیا مراد ہے اس کا پتہ بڑی مشکل سے چلتا ہے کیونکہ اس لفظ میں عربی ریگستانوں کے بدّو، ہندوستان کے ہندو، سائبیریا کے جنوبی میدانوں کے خانہ بدوش، منگولیا کی گلہ بان قومیں، چین کے اسلاف پرست کافر اور جاپان کے پشتینی امراء سب شامل ہیں۔ ان مختلف

ایشیائی ممالک میں بھی یورپ کے ملکوں کی طرح بڑے زبردست قومی اور معاشرتی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن مشرق اور مغرب دو بالکل مختلف چیزوں کی حیثیت سے محض ان لوگوں کے دماغ میں ہیں جو یا تو سامراجی حکومت کے لیے بہانے تلاش کرتے ہیں یا جن کو یہ خیال بطور قصّہ یا روایت کے اپنے پریشان خیال بزرگوں سے ترکہ میں ملا ہے۔ اختلافات تو یقیناً ہیں لیکن یہ زیادہ تر اقتصادی ترقی کی مختلف منزلوں پر ہونے کی وجہ سے ہیں۔

مغربی و شمالی یورپ میں غیر ذمہ دارانہ شخصی حکومت کے بجائے موجودہ نظام سرمایہ داری عنانِ سلطنت سنبھالتا نظر آتا ہے۔ اس نظام کی خصوصیت ہے کہ ایک مقابلے کی صورت پیدا ہو اور ایک بڑے پیمانے پر چیزیں تیار کی جائیں۔ کم حیثیت والے مٹ جاتے ہیں۔ چھوٹے موٹے دوکانداروں کی گزر نہیں۔ اور جو رکاوٹیں کہ رعایا اور کسانوں پر جاگیردارانہ نظام میں تھیں وہ دور ہو جاتی ہیں۔ اور ان کاشتکاروں کی رہی سہی زمین بھی چھن جاتی ہے۔ ایک کثیر التعداد جماعت بے روزگار ہو جاتی ہے اور ان کے پاس اب زمین بھی نہیں ہوتی کہ اسی کو بو جوت کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ اس طرح عوام کا ایک بڑا طبقہ تیار ہو جاتا ہے جس کے پاس نہ زمین ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی جائداد۔ ساتھ ہی ساتھ جو بندشیں کہ جاگیردارانہ نظام میں اشیاء کی قیمت پر تجارت کے محدود ہونے کی وجہ سے تھیں ہٹ جاتی ہیں اور ایک بازارِ عام کی بنا پڑتی ہے۔ یہی بڑھ کر بازارِ دنیا بن جاتا ہے جو کہ نظامِ سرمایہ داری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنا دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو وہ کثیر جماعت جس کے پاس زمین نہیں ہے اور جو کارخانوں میں بحیثیت مزدور کے نوکری کرنے پر مجبور ہے۔ دوسرے وہ بازارِ عام جہاں مشین کی بنائی ہوئی اشیاء فروخت کی جا سکتی ہیں یہ بہت جلد بڑھتا ہے اور ساری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ ان ممالک میں جہاں اس کی تخلیقی صورت ہے اس کے بدن میں چستی ہے اور اس کے خون میں روانی ہے۔ لیکن ان ملکوں یا نو آبادیوں میں جہاں اس کی مغربی مشینوں کی اشیائے ساختہ صرف خریدی اور استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ اس کی کیفیت محض ایک مجہول کی سی ہے۔ مغربی شمالی یورپ اور اس کے کچھ بعد سے شمالی امریکہ تمام

دنیا کی آمدنی کے ذرائع خاص اپنی منفعت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ ایشیا، افریقہ مشرقی یورپ اور جنوبی امریکہ سے ناجائز فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے دنیا کی دولت میں اضافہ تو بہت کچھ کیا ہے لیکن یہ دولت صرف چند قوموں اور چند ہاتھوں میں آگئی ہے۔

سرمایہ داری کی اس ترقی میں انگلستان کے لیے ہندوستان پر قابو جمائے رکھنا نہایت درجہ اہم ہے۔ ہندوستان کی دولت نے شروع شروع میں تو انگلستان کی صنعتی ترقی میں مدد دی اور اس کے بعد ہندوستان برطانوی کارخانوں کے لیے جنس خام کا ایک وسیع گودام اور برطانوی اشیائے ساختہ کے لیے ایک بہت بڑا بازار بن گیا۔ انگلستان کو دولت جمع کرنے کی خواہش اتنی دل سے لگ گئی کہ اس نے اپنے اہل زراعت کو اہل صنعت پر قربان کر دیا۔ انگلستان مثل ایک بڑے شہر کے بن گیا اور ہندوستان اس کی آراضی ملحقہ بن کر رہ گیا۔

اس طرح دولت کا صرف چند ہاتھوں میں یکجا ہوتا رہنا برابر جاری رہا لیکن انگلستان ہندوستان اور دیگر ممالک سے اس قدر بے حساب دولت مارلایا تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ مزدوروں تک بھی پہنچا اور ان کا معیارِ زندگی بلند ہونے لگا۔ سرمایہ داروں کا نفع اتنا کثیر تھا کہ وہ آسانی سے مزدوروں کے ساتھ وہ رعائتیں کر سکتے تھے جس سے ان کا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور ان کا اضطراب جاتا رہا۔ تنخواہیں بڑھیں۔ کام کرنے کے اوقات کم ہوئے بیمے کا رواج اور دیگر تدابیر کارخانے کے کام کرنے والوں کی رفاہ اور آسائش کے لیے عمل میں لائی گئیں۔ انگلستان بھر پر ایک عام خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا جس سے کہ پیشہ ور مزدوروں کی بے اطمینانی بھی دب گئی۔

ہندوستان کی صنعتی ترقی یہ ہوئی کہ وہ غیر ملکی مشینوں کی تیار کردہ اشیاء کا خریدار بن گیا۔ اس مجہولانہ ترقی سے زمین پر بار برابر بڑھتا گیا۔ گاؤں والوں کی اپنی صنعتیں کچھ تو زبردستی مٹا دی گئیں اور کچھ اقتصادی طاقتوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ لیکن ان کی جگہ کوئی اور ذریعہ معاش پیدا نہیں ہوا۔ صنعتی ترقی کے تمام آثار ملک میں موجود تھے لیکن انگلستان کی یہ مصلحت نہ تھی اور مشینوں پر ٹیکس لگا کر اسی بات کی کوشش کی گئی کہ

صنعت کے یہاں قدم نہ جم سکیں اس طرح زمین پر بار بڑھا اور ساتھ ہی ساتھ افلاس اور بے روزگاری۔ ہندوستان بجائے صنعتی ترقی کرنے کے اور زیادہ زراعتی بن گیا۔

لیکن زیادہ عرصے تک نہ تو تاریخی رفتار روکی جا سکتی ہے اور نہ اقتصادی تقاضہ رد کیا جا سکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ عامی مفلوک الحالی ترقی پر تھی۔ چند چھوٹے چھوٹے گروہوں نے کچھ سرمایہ اکٹھا کیا اور اس کو کسی کام میں لگانا چاہا اور اس طرح کچھ تو ہندوستانی سرمائے سے لیکن زیادہ تر غیر ملکی سرمائے سے ہندوستان کی اس صنعت کا جس کا کہ مشینوں پر دارومدار ہے آغاز ہوا۔ ہندوستانی سرمایہ بہت کچھ غیر ملکی سرمائے کے دست نگر ہے اور پورے طور پر بیرونی مہاجنی نظام کے قابو میں ہے۔ یہ بات سب کو بخوبی معلوم ہے کہ جنگ عظیم نے ہندوستانی صنعتوں کو کتنا فائدہ پہنچایا اور اس کے بعد سے سامراجی مصلحتوں کی بنا پر انگلستان نے ہندوستانی صنعتوں کے ساتھ جو اس کا طرزِ عمل تھا اسے تبدیل کر دیا۔ اب وہ اس کی ترقی کا مددگار بن گیا لیکن زیادہ تر پردیسی سرمائے سے نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ایسی صنعتوں نے ترقی کی جو محض نام کے لیے سدیشی ہیں اور اس طرح برطانوی سرمائے کی گرفت ہندوستان پر اور زیادہ مضبوط ہونے لگی۔

تمام مشرقی ممالک کی دولت جس کو کہ مغرب اڑا لیے لیے جا رہا تھا اس کا اس صنعتی ترقی اور قومی تحریکوں نے سدِّ باب کیا اور اس طرح مغربی سرمائے کا نفع کم ہونے لگا لڑائی کے نتائج اور قرضے یوں ہی ممالک متعلقہ کے لیے ایک بڑا زبردست بار تھے۔ دولت بھی اتنی نہیں رہی تھی اور نہ اتنی نفع کی آمدنی تھی کہ پیشتر کی طرح مغربی کارخانوں کے کام کرنے والوں کو تقسیم کی جا سکے اس سے مزدوروں کی شورش اور مطالبات بڑھے۔ اس کے علاوہ ان کے جوش کو ابھارنے اور انھیں ترغیب دینے کے لیے روسی انقلاب کی زندہ مثال آنکھوں کے سامنے تھی۔

اسی دوران میں دو باتیں اور خاموشی کے ساتھ مگر بہت تیزی سے رونما ہو رہی تھیں ایک تو بڑے بڑے ٹرسٹ کاروباری معاہدے اور ساجھے داریاں قائم کی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت اور طاقت سمٹ کر صرف معدودے چند لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ دوسرے اشیاء کی طرزِ ساخت کی روزافزوں ترقی اور تبدیلی کی وجہ سے انسانی کام کرنے والوں کی

جگہ رفتہ رفتہ مشینوں نے لے لی اور اس طرح برابر مزدوروں کی ایک تعداد بے روزگار ہوتی چلی گئی۔ ان باتوں کا ایک عجیب نتیجہ نکلا۔ ٹھیک جبکہ صنعت اپنی تمام تاریخ حیات میں سب سے بڑے پیمانے پر چیزیں بناکر بازار میں لا رہی تھی اسی وقت بجز چند افراد کے ان کا کوئی گاہک نہ تھا کیونکہ زیادہ تر لوگ ان کے خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ بے روزگاروں کی فوجیں تیار ہوگئی تھیں اور ان کی کوئی آمدنی نہ تھی تو خرچ کہاں سے کرتے۔ اور کمانے والوں میں سے بھی زیادہ تر لوگ اس قابل نہ تھے کہ کچھ بچا سکتے۔ ایک نئی حقیقت ان صنعتی سپہ سالاروں کے چوندھیائے ہوئے دماغوں میں یکایک بجلی کی طرح کوند گئی۔ (ہندوستان والوں پر ابھی یہ بے نقاب نہیں ہوئی ہے) اور وہ حقیقت یہ تھی کہ بے حساب تعداد میں چیزیں تیار کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ بے حساب تعداد میں یہ چیزیں خریدی جائیں اور استعمال میں لائی جائیں۔ لیکن اگر عوام کے پاس پیسہ نہیں ہے تو وہ انھیں کیسے خرید سکتے ہیں یا صرف میں لا سکتے ہیں! لہٰذا اور اشیار تیار کرنے سے کیا فائدہ! اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیار کا بنانا کم کر دیا جاتا ہے بلکہ قریب قریب روک دیا جاتا ہے۔ اس سے بے روزگاری اور پھیلتی ہے اور اس کی وجہ سے چیزوں کی بکری اور کم ہو جاتی ہے۔

سرمایہ داری پر یہ نازک وقت پچھلے چار سال سے کچھ زائد زمانے سے گزر رہا ہے جس کی وجہ سے غریب دنیا کو سانس لینا مشکل ہے۔ دراصل یہ دنیا کی دولت کی غلط تقسیم کا نتیجہ ہے چونکہ یہ دولت صرف چند ہاتھوں میں جمع ہو گئی ہے۔ یہ بیماری سرمایہ داری ہی کا جوہر ہے یہ اسی کے سائے میں پرورش پاتی ہے یہاں تک کہ یہ اسی نظام کا جو اسے وجود میں لایا خون چوس کر خاتمہ کر دیتی ہے۔ دنیا میں نہ دولت کی کمی ہے نہ اناج کی اور نہ ان تمام چیزوں کی جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ آج دنیا جتنی دولتمند ہے اتنی کبھی نہ تھی اور عنقریب ہی اس سے بھی کہیں زیادہ ترقی کر جائے گی۔ یہ تو محض نظام کی خرابی ہے کہ ایک طرف تو کروڑوں آدمی فاقہ کشی کرتے ہیں اور بے آب و دانہ بسر کرتے ہیں اور دوسری طرف کھانے پینے کی چیزیں اور دیگر اشیار کثیر تعداد میں پھینک دی جاتی ہیں۔ کھیتوں میں زہریلے کیڑے پیدا وار کو ضائع کرنے کے لیے جان بوجھ کر چھوڑے جاتے ہیں فصلیں کاٹی نہیں جاتی ہیں اور مختلف قومیں مل کر اس بات کا مشورہ کرتی ہیں

کہ آئندہ سالوں کی گیہوں، روئی، چائے، قہوہ اور دیگر اشیاء کی پیداوار کی روک تھام کس طریقے سے کی جائے۔ اوائلِ زمانہ سے آج تک انسان قدرت کی طاقتوں سے اپنی زندگی کی محض ضروریات حاصل کرنے کے لیے لڑتا رہا اور اب جبکہ قدرت نے اپنی وہ دولت جو کہ دنیا سے مفلسی کو یک لخت مٹا دینے کے لیے کافی ہے اس پر نچھاور کر دی اس نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کو جلا دیا اور ضائع کر دیا اور اس طرح پہلے سے بھی زیادہ غریب اور مفلوک الحال ہو گیا۔

تاریخ میں ایک کذب نما حقیقت کی اس سے زیادہ حیرت انگیز مثال نہیں ملتی۔ یہ بات بخوبی عیاں ہو گئی ہے کہ صنعت کا سرمایہ دارانہ نظام پیشتر جو کچھ بھی اس نے خدمتیں کی ہوں دنیا کی موجودہ تخلیقی ضرورتیں پوری نہیں کرتا۔ علمی اور فنی واقفیت ہماری موجودہ طرزِ معاشرت سے بہت آگے بڑھ گئی ہے اور پیشتر کی طرح موجودہ فساد کی وجہ یہی تفریق ہے جب تک کہ یہ دوری مٹائی نہ جائے گی اور کوئی ایسا نظام جس میں خیال کی نئی اصطلاحوں کی عملی گنجائش ہو رائج نہ کیا جائے گا۔ یہ بدنظمیاں غالباً قائم رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جن کے اغراض پرانے نظام سے وابستہ ہیں اس نئے نظام کی ضرور مخالفت کریں گے حالانکہ یہ ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا ہے اور جہاں تک ان سے ممکن ہوگا وہ اپنے محدود حقوق چھوڑ کر تمام حقوق میں حصہ بٹانے کو تیار نہ ہوں گے۔

یہ دراصل اخلاقی سوال نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں لیکن اس کا ایک اخلاقی پہلو ضرور ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سرمایہ دار پر لعنت بھیجی جائے اور سرمایہ داروں کو گالیاں دی جائیں۔ سرمایہ داری نے دنیا کی بڑی خدمت کی ہے اور انفرادی حیثیت سے سرمایہ دار ایک بڑی مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزوں سے زیادہ باوقعت نہیں۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ یہ واقعہ ہے کہ نہیں، کہ نظامِ سرمایہ داری کا اب زمانہ نہیں رہا اور اس کی جگہ ایک ایسے نظام کو لینی چاہیے جو انسانی معاملات کا نظام اس سے بہتر اور زیادہ معقول طریقے پر کرے اور جو انسانی واقفیت اور علمی ترقی کے دوش بدوش ہو۔

اس زمانے میں باوجود چند مقامات پر صنعتی ترقی ہونے کے ہندوستان کی زمین کا بار

کم نہ ہوا بلکہ اور زیادہ ہوگیا۔ اقتصادی بدامنی اور پھیلی درمیانی طبقہ بڑھا اور اپنی ترقی کی راہیں مسدود دیکھ کر سیاسی تبدیلیوں کا مطالبہ کرنے لگا اور شورش برپا کردی۔ اسی قسم کے اسباب مشرق کے تمام مفتوح ممالک اور نوآبادیوں میں رونما ہوئے خصوصاً لڑائی کے بعد مصر اور دیگر ایشیائی ممالک میں قومی تحریکیں بہت تیزی کے ساتھ زور پکڑنے لگیں۔ یہ تحریکیں دراصل عوام اور ادنیٰ حیثیت کے آدمیوں کی مفلوک الحالی اور مصیبت کا نتیجہ تھیں۔ ان تحریکوں کے طرزِ عمل میں بھی ایک حیرت انگیز مشابہت تھی وہی حکومت سے عدم تعاون۔ بدیشی مال کا بائیکاٹ۔ قانون ساز مجالس سے گریز۔ اور ہر قسم کی ہڑتال وغیرہ۔ کبھی کبھی ان ہنگاموں میں تشدد بھی رونما ہو جاتا تھا جیسا کہ مصر اور سیریا میں ہوا لیکن عام طور پر امن کے طریقوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں تو گاندھی جی کی رائے سے عدم تشدد کانگریس کا بنیادی اصول بنا لیا گیا تھا۔ آزادی کے لیے یہ تمام قومی جدوجہد آج تک قائم ہیں اور جب تک کہ نظامِ دنیا کا اطمینان بخش فیصلہ نہ ہو جائے ان کا جاری رہنا لازمی ہے۔ یہ فیصلہ حقیقتاً محض حکومت خود اختیاری کی فطری خواہش کا پورا کرنا نہیں ہے بلکہ بھوکوں کا پیٹ کس طرح بھرا جائے اس سوال کا حل کرنا ہے۔

وہ زبردست انقلاب جس نے کہ لڑائی کے بعد کے زمانے میں ایشیا کے سینے میں ایک قومی اضطراب پیدا کر دیا تھا اس کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہوگیا اور طبیعتیں سکون پذیر ہونے لگیں۔ ہندوستان میں اس نے اسمبلی اور کونسل میں سوراجسٹ پارٹی کے داخلے کی شکل اختیار کی یورپ میں بھی ۱۹۲۵ء اور اس کے قریب کا زمانہ امن وسکون کا گزرا ہے جب جنگِ عظیم کے بعد جو نئی صورتیں پیدا ہوئی تھیں ان کا جائزہ لیا جا رہا تھا اور ان سے مناسبت پیدا کی جا رہی تھی۔ وہ انقلابی گھٹا جو یورپ پر ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں چھائی ہوئی تھی وہ برس نہ سکی اور بادل منتشر ہوگئے۔ امریکہ کی دولت نے یورپ کے خزانے معمور کر دیے اور ان لڑائی کے تھکے ماروں کی نظر کے سامنے ایک خوشحالی کا سراب پھر پیش کر دیا۔ لیکن اس خوشحالی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اور جب ۱۹۲۹ء میں امریکہ نے یورپ اور جنوبی امریکہ کو روپیہ ادھار دینا بند کر دیا تو یہ نمائشی عمارت یکایک بیٹھ گئی اس حادثے کے یوں تو بہت سے اسباب تھے لیکن یہ دراصل ایک زوال رسیدہ نظام

سرمایہ داری کے فطری اختلافات کا نتیجہ تھا کہ یہ تاش کے پتوں کی لاٹ گرنی شروع ہوگئی۔ پچھلے چار سال سے یہ بڑی تیزی کے ساتھ گرتی چلی جارہی ہے اور یہ رفتار ہنوز قائم ہے۔ کوئی اسے زمانۂ پستی کہتا ہے۔ کوئی اسے زوالِ تجارت سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی اسے محض بُرا وقت سمجھتا ہے لیکن دنیا مجبور ہو کر اس بات کا احساس کر رہی ہے کہ دراصل یہ نظامِ سرمایہ داری کے چراغِ سحری کی جھلملاہٹ ہے۔

بین الاقوامی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ بین الاقوامی تعاون ٹوٹ چکا ہے بازارِ دنیا جس کو تعمیرِ سرمایہ داری کا سنگِ بنیادی کہنا چاہیے متزلزل ہو چکی ہے اور ہر قوم کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ آئندہ کیا ہوگا یہ تو نہیں بتایا جا سکتا لیکن جو بات کہ یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کی طاقتیں مل کر بھی اس پرانے نظام کو برسرِ اقتدار نہیں کر سکتیں۔

جتنا ہی کہ پُرانا نظام زیادہ متزلزل ہوا اتنی ہی مزدور پیشہ گروہ کی مخاصمت اور سنگین ہوگئی۔ جب اس مخالفت نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کی تو اس جماعت نے جو کہ قابض تھی اپنے جزئی تفرقے بھلا دیے اور اس مشترک دشمن سے لڑنے کے لیے منظم ہوگئی۔ اس سے فاشزم کی بنا پڑی اور جہاں اس کا رنگ شوخ نہ ہونے پایا بلکہ ہلکا رہا وہاں اس نے اپنا نام قومی حکومت رکھ لیا۔ دراصل یہ قابض جماعت کی اپنی طاقت اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کی آخری کوشش ہے۔ انیسویں صدی کی جمہوریت کے طریقے برطرف کر دیے جاتے ہیں اور لڑائی اور شدید ہو جاتی ہے۔ لیکن چاہے وہ فاشزم ہو یا قومی حکومت جب تک کہ وہ ان بنیادی اقتصادی اختلافات کو مٹانے کی کوئی صورت نہیں نکالے گی جو کہ نظامِ سرمایہ داری کے ضمیر میں شامل ہیں اس کو ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑے گا دولت کی ناہمواری اور اس کی مناسب تقسیم کے مسئلے کو تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ ان بڑے ملکوں میں جہاں نظامِ سرمایہ داری رائج ہے امریکہ ہی صرف ایک وہ ملک ہے جہاں آج حکومت کی طرف سے دولت کی ناہمواری کو گھٹانے کی کسی قدر کوشش کی جا رہی ہے۔ پریسیڈنٹ روسولٹ کے پروگرام کا اگر مکمل طور پر نفاذ ہوا تو ایک قسم کی سلطنتی اشتراکیت کا ظہور ہوگا۔ زیادہ تر گمان تو اسی بات

کا ہے کہ یہ کوشش ناکامیاب رہے گی اور فاشزم برسرِ اقتدار آجائے گا۔ انگلستان حسبِ عادت ضد اور پراگندہ دماغی سے کام لے رہا ہے اور غیبی امداد کا منتظر ہے۔ اس نے اسی زمانے میں ہندوستان کی دولت اور دیگر ذرائع آمدنی سے بہت کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن یہ تو محض وقتی تسکین ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ تمام قومیں پھسلتی ہوئی کھائی کے کگارے تک آگئی ہیں۔

آج اگر ہم دنیا پر ایک نظر ڈالیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ سرمایہ داری نے اشیاء کی ساخت کا مسئلہ تو حل کر لیا ہے لیکن جو اس مسئلہ کا جزو ہے یعنی ان اشیاء کی مناسب تقسیم اس کا انتظام کرنے میں قاصر رہی ہے۔ اس انتظام کے لیے سرمایہ داری فطری طور پر ناقابل ہے اور محض چیزیں بنانے سے دنیا کا میزان بگڑ جاتا ہے اور ایک پلّہ جھک جاتا ہے اگر کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس سے خریدنے والے کی استطاعت اور دولت کی تقسیم میں توازن پیدا ہو سکے تو سرمایہ داری نظام کی ناہمواریاں دور ہو سکتی ہیں اور اس طرح اس کی جگہ ایک سے زائد معقول نظام لے سکتا ہے۔

سرمایہ داری نے سامراجی نظامِ حکومت کی بنا ڈالی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ جب سامراجی طاقتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے نوآبادیوں کی تلاش کی تو آپس میں یہی بنائے مخاصمت پیدا ہوئی۔ ہر سامراجی حکومت کو نوآبادیوں کی ضرورت ہے کیونکہ یہی اس کے کارخانوں کے لیے جنسِ خام اور اس کی تیار کردہ اشیاء کے لیے بازار مہیا کرتی ہیں۔ سامراجی طاقتوں کی نوآبادیوں کی قومیت سے روز بروز مخالفت زیادہ ہوتی جاتی ہے پیشہ ور مزدور جن کی حق تلفی ہوئی ہے ان کی زبردست تحریکوں سے آئے دن مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور معاشرتی اور تمدنی نزاع بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں گھڑی گھڑی نازک لمحات آجاتے ہیں جس کی وجہ سے نرخ اور محصول کے جھگڑے وسیع پیمانے پر برابر ہوتے رہتے ہیں اور ہر بار معاملے کی نزاکت پیشتر کے مقابلے میں زیادہ بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ اب یہ نوبت پہنچی ہے کہ ہماری زندگی میں ایک مسلسل اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہر وقت یہی اندیشہ رہتا ہے کہ تار نہ ٹوٹ جائے اور جنگ کا خوفناک مغنی اپنا مہیب ساز نہ چھیڑ دے۔

تاہم یہ یاد رکھنا مناسب ہے کہ آج دنیا میں کھانے کی اور دیگر ضروریات کی چیزوں کی افراط ہے۔ آج کل کی ساری مصیبت محض اس وجہ سے ہے کہ موجودہ نظام ان کو تقسیم کرنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں بھی یہ طریقہ دریافت نہ کرسکیں کیونکہ ان کے نمائندے بااختیار لوگوں کے حقوق کی پاسداری کرنے آئے تھے اور نظام میں کوئی تبدیلی تجویز کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اقتصادی واقعات اور علمی ترقی اس عمارت کی جوان ہی نے بنائی تھی بنیادیں ہلائے ڈال رہی ہے لیکن وہ ابھی اپنے اندھیرے کمروں میں بیٹھے اندھوں کی طرح ٹٹول رہے ہیں۔ ہر جگہ کے اہلِ خرد موجودہ نظام کی قطعی ناقابلیت تسلیم کرتے ہیں گو ان خامیوں کو رفع کرنے کے لیے ان کی تجاویز مختلف ہیں۔ اشتراکیت اور پنچایتی راج کے حامی نہایت یقین کے ساتھ اشتراکیت کو اس مرض کا علاج سمجھتے ہیں اور ان کی تعداد روز افزوں ہے کیونکہ ان کا دعویٰ مدلّل اور مضبوط ہے۔ انجینیروں کے ایک گروہ کا جس کو ٹکنوکریٹز TECHNOCRATIES کہتے ہیں یہ خیال ہے کہ روپے کو دنیا سے غائب کردینا چاہیے۔ اور اس کی جگہ قوت کی اکائی کو دینی چاہیے۔ اس تجویز نے امریکہ میں بڑی ہلچل مچادی ہے۔ انگلستان میں میجر ڈگلس کی "مدنی اعتبار" کی تخیل زیادہ مقبول ہوتی جاتی ہے۔ اس تخیل کی رو سے ملک کی دولت تمام باشندوں میں برابر تقسیم کردی جائے گی اور حصّوں پر سب کو نفع تقسیم ہوگا۔ قومی اور بین الاقوامی بازاروں میں تجارت کے بجائے تبادلہ رائج ہوگا۔ ایسی انقلابی تجاویز کا خوش حال طبقے میں اور خصوصاً اہلِ دماغ اور اہلِ خرد میں تذکرہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی ذہنیت میں کتنی زبردست تبدیلی پیدا ہورہی ہے ہم لوگوں میں سے کتنے آدمی اس بات کو ذہن میں لاسکتے ہیں کہ دنیا میں روپیہ نہ ہو اور اس کے بجائے قوت کی اکائی سے قیمت کا اندازہ کیا جائے اور پھر بھی اس تجویز کو کوئی غیر ذمّے دار اور مشتعل مزاج شورش برپا کرنے والے پیش نہیں کررہے ہیں بلکہ اس کی وکالت نہایت متانت اور جوشِ خلوص کے ساتھ مشہور و معروف اقتصادی ماہرین کررہے ہیں۔ یہ تو دنیاوی پس منظر ہے۔

ایشیائی پس منظر بھی اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے لیکن اس کی اپنی خصوصیات بھی ہیں۔ قومیت اور سامراجی طاقت کی جنگ کے لیے ایشیا ہی خاص رزم گاہ ہے۔

یورپ اور شمالی امریکہ کے کھلے ہوئے پھولوں کے مقابلے میں ایشیا ابھی تک ناشگفتہ غنچے کی مانند ہے۔ اس کی آبادی کثیر ہے اور اگر اسے خریدنے کی استطاعت ہو تو یہ کثیر تعداد میں اشیاء کو استعمال کرسکتا ہے۔ سامراجی طاقتیں جو کہ بہت عاجز آگئی ہیں اور جو اپنی اقتصادی کشادگی کے لیے گھبرا گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالتی ہیں ان کو اب بھی باوجود قومیت کی رکاوٹوں کے ایشیا میں بہت گنجائش معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے مغرب اپنا فالتو مال نکالنے کے لیے ایشیا پر ہمیشہ نظر ڈالتا ہے اور اس طرح چاہتا ہے کہ اس کا نظام سرمایہ داری کچھ دنوں کے لیے اور مستحکم ہو جائے۔ مشرق میں سرمایہ داری ابھی کم عمر ہے یہ پورے طور پر جاگیردارانہ نظام تک پر قابو نہیں پاسکی ہے اور اس کے برسراقتدار ہونے سے پیشتر ہی بہت سی طاقتیں اس کے مقابلے پر آمادہ ہوگئی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نظام سرمایہ داری اگر یورپ اور امریکہ میں ٹوٹ گیا تو ایشیا میں بھی جانبر نہ ہو سکے گا۔

قوم پرستی ایشیا میں اب بھی سب سے زبردست طاقت ہے (ہم اس وقت ایشیائی روس کو نظرانداز کرسکتے ہیں) یہ تو قدرتی بات ہے کہ جس ملک میں غیرملکی حکومت ہوگی اس کے دل میں قومیت کا جذبہ پہلے پیدا ہوگا لیکن وہ زبردست اقتصادی طاقتیں جو آج دنیا کی صورت تبدیل کیے دے رہی ہیں وہ رفتہ رفتہ اس قومیت پر اپنا رنگ جماتی جاتی ہیں اور ہر جگہ اس کو اشتراکیت کا لباس پہنا کر پیش کرتی ہیں۔ سیاسی آزادی کے لیے قومی لڑائی رفتہ رفتہ اقتصادی آزادی کے لیے معاشرتی جنگ میں تبدیل ہو رہی ہے۔ خودمختاری اور مشترکہ حکومت ہمارے نصب العین بن رہے ہیں۔ کوئی ایک پر زور دیتا ہے اور کوئی دوسرے پر۔ لیکن یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں جتنی ہی کہ سیاسی آزادی میں دیر ہوتی جاتی ہے اتنا ہی تصویر کا دوسرا رخ زیادہ جاذبِ نظر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب خاص طور پر دنیا کی حالت دیکھتے ہوئے یہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کے کم سے کم چند ممالک کو سیاسی اور تمدنی آزادی ساتھ ہی ساتھ ملے گی یہ ایشیائی پس منظر ہے۔

دیگر ایشیائی نوآبادیوں کی طرح ہندوستان میں بھی پرانی قومی ذہنیت اور نئی اقتصادی ذہنیت میں آج ایک جنگ ہوتی نظر آتی ہے۔ ہم میں سے اکثر نے قوم پرستی کی آب و ہوا میں آنکھیں کھولی ہیں اور پرورش پائی ہے اور ہمارے دماغ اور خیال کا جو رجحان زندگی بھر کی

عادت سی پڑ چکا ہے اس کا چھوڑنا بہت مشکل ہے پھر بھی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا نظریہ ناقص ہے کیونکہ یہ دنیا اور ملک کی موجودہ حالتوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔ دونوں کے درمیان میں ایک کھائی نظر آتی ہے۔ ہم اس کو پار کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک نئی ذہنیت پیدا کرنے میں ہمیشہ خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔ ہم میں سے بہت لوگ آج اسی وجہ سے پریشان اور پراگندہ مزاج ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک کنارے پر بند پانی میں پڑے رہ جائیں جہاں ان کشتیوں کی گندگی آکر جمع ہوتی ہے جو ترقی کی دھارا پر بڑھتی چلی جا رہی ہیں تو ہمیں کسی نہ کسی طرح اسے پار تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب انیسویں صدی بیسویں صدی کے معاملات حل نہیں کر سکتی تو ساتویں صدی یا اور پرانے زمانے کی ذہنیت کیسے کوئی مناسب تصفیہ سوچ سکتی ہے۔

دنیاوی اور ایشیائی پس منظر پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اپنے قومی مسئلے کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا ہم سے اتنا قریبی رشتہ ہے کہ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ محض ہمارے لیے مخصوص ہے اور دنیاوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ ایشیائی مسئلے کا ایک جزو ہے اور ایشیائی مسئلہ دنیاوی معاملات کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہم اگر چاہیں بھی تو اس کو جدا نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ہندوستان میں ہوگا اس کا اثر دنیا پے گی اور دنیا کے واقعات ہندوستان کے مستقبل پر اثر ڈالیں گے۔ دراصل آج دنیا کے سامنے یہی تین بڑے مسائل ہیں۔ نظام سرمایہ داری کی قسمت کا فیصلہ جو حقیقتاً یورپ اور امریکہ کی قسمت کا فیصلہ ہے۔ ہندوستان کا مستقبل اور چین کا مستقبل اور یہ تینوں ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔

ہندوستان کی لڑائی اس بڑی لڑائی کا ایک جزو ہے جو روئے زمین پر ہر جگہ مجبور اور بے کس اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ دراصل یہ ایک اقتصادی جنگ ہے جس کو لڑنے کے لیے بھوک اور ناداری غریبوں کو مجبور کر رہی ہے حالانکہ یہ قومیت کی پوشاک پہن کر سامنے آتی ہے۔

ہندوستانی آزادی اس لیے ضروری ہے کہ جو بار ہندوستانی جنتا پر اور درمیانی

طبقے پر ہے وہ ناقابل برداشت ہے اور یہ فوراً کم یا دور ہونا چاہیے۔ جتنا ہی یہ بوجھ کم ہوگا اتنی ہی آزادی حاصل ہوگی۔ یہ بوجھ زیادہ تر تو ایک پردیسی حکومت کے مقررہ حقوق کے وجہ سے ہے اور کچھ چند ہندوستانی اور غیر ملکی گروہوں کی اغراض کے سبب سے۔ اس طرح آزادی حاصل کرنا جیساکہ گاندھی جی نے حال ہی میں کہا ' حاصل شدہ حقوق کے زائل کرنے کا دوسرا نام ہے ؛ اگر کوئی دیسی حکومت پردیسی حکومت کی جگہ لے لیکن ان حقوق کو بدستور قائم رکھے تو اس میں آزادی کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔

ہمارے دماغوں کو یہ عجیب عادت پڑ گئی ہے کہ ہم آزادی کو کاغذی ضابطوں کے الفاظ میں تلاش کرتے ہیں۔ اس وکیلانہ ذہنیت سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں جو واقعاتِ زندگی کو بھول کر اور اقتصادی مسائل کو پس پشت ڈال کر محض قانونی الفاظ اور نظائر میں الجھی ہوئی ہے۔ وکیلوں کی عقل ماضی پر نظر ڈالتے ڈالتے گدّی میں آگئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سامنے دیکھنے کی قابلیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ لُنجے اور اپاہج بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن وکیل ایک کٹّر مذہب پرست کی طرح پیچھے ہی کی طرف قدم ڈالتا ہے کیونکہ دونوں کے نزدیک حقیقت صرف ماضی کے پردوں میں پوشیدہ ہے۔

گول میز کانفرنس کی تجاویز آج قریب قریب اتنی ہی مردہ ہیں جتنی کہ نور جہاں بیگم اور یہ کسی توجہ کی مستحق نہیں۔ اس کی کبھی نیت ہی نہ تھی کہ ہندوستانیوں کو نام کو بھی آزادی دے اس کا تو صرف منشا یہ تھا کہ چند ہندوستانی اہلِ غرض برطانیہ کی طرف ہو جائیں اور اس میں یہ کامیاب ہوئی۔ اس نے اس سوال کا جواب جو میں نے اس مضمون کے شروع میں پیش کیا تھا یعنی ہم کس کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں، اپنے بھگتوں کو نہایت اطمینان بخش اور میٹھے الفاظ میں دیا۔ اس نے برطانوی حقوق اور زیادہ وسیع کیے اور ان کی حفاظت اور پاسداری کا پورا وعدہ کیا۔ جیساکہ وٹھل بھائی پٹیل نے کہا اس نے ہوم رول تو دیا مگر وائسرائے کو۔ اس نے برطانوی سرمایہ داری کی بنیادیں اور زیادہ مستحکم کردیں اور برطانوی اہلکاروں کو بعض بعض صورتوں میں تو پہلے سے بھی زیادہ انعام بخشا۔ غیر ملکی فوج کے قبضے کو دائمی بنانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس نے والیانِ ریاست اور بڑے بڑے اہل دول کے جاگیردارانہ حقوق

کو اور زیادہ اہمیت دی اور ان کے اختیارات وسیع کیے۔

غرضکہ مختصراً یہ تجویز اُن اہل غرض کی حفاظت اور پائداری کے لیے تھی جو ہندوستانی جنتا کے حقوق مارے بیٹھے ہیں اور ان کا خون چوس رہے ہیں۔ یہ کار آمد محنت کرنے کے بعد جو کہ ان کے لیے مخصوص طور پر مفید تھی اس تجویز کے پیش کرنے والوں نے ہم کو یہ بتایا کہ ہر صوبے کو خود انتظامی قائم کرنے میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوگا۔ اس طرح محض یہی نہیں ہوا کہ عوام پر پُرانے بار بدستور قائم رہے بلکہ کچھ نئے بوجھوں کا اور اضافہ کر دیا گیا۔ یہ وہ ذہانت کا فیصلہ تھا جو گول میز کانفرنس کے شرکا نے اپنی ذکاوت اور تیز فہمی سے دریافت کیا۔ وہ اپنے اپنے گروہ کے حقوق کی پاسداری میں اتنے محو تھے کہ وہ صرف ۳۵ کروڑ کی ہندوستانی جنتا کو اتفاق سے بھول گئے۔

اس ضابطے کی حماقت وہ بچہ بھی بتا سکتا ہے جس نے سیاست میں آج ہی قدم رکھا ہو۔ قومی تحریک کی ساری بنا محض اقتصادی ترقی کی خواہش پر ہے اور اس کی ساری طاقت اور سارا جوش محض اس جذبے سے حاصل ہوتا ہے جو بے کس اور مجبور جنتا کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے اور ان کے حقوق ان کو دلانا چاہتا ہے۔ اگر یہ سختیاں قائم رہیں بلکہ اور بڑھیں تو یہ ایک معمولی دماغ والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ لڑائی محض جاری ہی نہیں رہے گی بلکہ اور شدید ہو جائے گی۔ افسران اور افراد چاہے رہیں یا جائیں، چاہے تھک جائیں یا ان کا دل اُچاٹ ہو جائے۔ چاہے صلح کر لیں یا دشمن سے مل جائیں لیکن جو مصیبت کی ماری جنتا ہے وہ تو برابر لڑے ہی جائے گی کیونکہ اس کے اصل افسر تو بھوک اور ناداری ہیں جو اسے مار مار کر لڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سوراج یا آزادی اس کے لیے ایک حسین کاغذی چیز نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا سوال جس پر آئندہ غور کرنا ہے۔ اس کے لیے تو یہ آج اور ابھی کا سوال ہے اور اس کو فوری تسکین درکار ہے ہرن کا کباب کھانے والے کے لیے تو یقیناً لذیذ ہوتا ہے لیکن بے چارے ہرن کو وہ تمام حسین دلیلیں قائل نہیں کر سکتیں جو قربانی کی عظمتوں کا احساس دلاتی ہیں۔ اور نہ کھانے والے کے سامنے سجا کر پیش کیے جانے پر اس کی تشفی ہو سکتی ہے۔

لہٰذا ہندوستان کی پہلی منزل وہی ہو سکتی ہے جہاں جنتا پر زبردستی کرنے کی کوئی

گنجائش نہ ہو اور ان کو سنانا بند کر دیا جائے۔ سیاسی زبان میں اس کے معنی خود مختاری اور برطانیہ یعنی سامراجی حکومت سے قطع تعلق کرنے کے ہوں گے۔ اقتصادی اور معاشرتی طور پر اس کا نتیجہ مقررہ حقوق یا مخصوص گروہوں کے مخصوص اختیارات کا زائل کرنا ہوگا۔ دنیا اسی بات کے لیے لڑ رہی ہے اور اس طرح آزادیٔ ہندوستان کی لڑائی بھی دنیا کی لڑائی کا ایک جز و بن جاتی ہے۔ ہمارا منشا مفادِ عام ہے یا نازونعم کے پالے ہوئے اہلِ غرض کے مخصوص حقوق کی پاسداری! ہم میں سے ہر ایک کو اس سوال کا جواب صاف الفاظ میں بغیر گول مول باتیں کیے ہوئے دینا ہوگا۔ جہاں قوموں کی قسمت اور کروڑوں انسانوں کی زندگی کا مسئلہ در پیش ہے وہاں دورُخی باتیں کرنے کی گنجائش نہیں۔

جب سے کہ عوام نے سیاست میں قدم رکھا ہے۔ محلوں میں سازش کرنے اور آراستہ کمروں میں بیٹھ کر سیاسی معاہدے اور تصفیہ کرنے کا زمانہ گزر گیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو دربارِ شاہی کی تہذیب نہیں آتی۔ ہم نے ان کو تہذیب سکھانے کی تکلیف ہی کب اٹھائی۔ انھوں نے صرف واقعات کے مدرسے میں تعلیم پائی ہے اور مصیبت ان کی مدرّس رہی ہے۔ انھوں نے اپنی سیاست اُن بڑی تحریکوں سے حاصل کی ہے جن میں افراد کا اور گروہوں کا سچا کردار نظر آجاتا ہے۔ قانون شکنی کی تحریک نے جو ہندوستانی جنتا کو سبق دیا ہے اس کو وہ کبھی نہیں بھول سکتی۔

خود مختاری کے لفظ کو اس بُری طرح سے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ ہمارے مقصد کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کرتا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا موزوں لفظ بھی نہیں ہے اور چونکہ ہم کو اس سے بہتر لفظ نہیں ملتا اس لیے اسی کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ قومی علیحدگی آج کل کی دنیا میں جو روز بروز سمٹتی جاتی ہے اور ایک ہوتی جاتی ہے، نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب ہے۔ قومی اور بین الاقوامی تحریکیں آج کل دنیا پر چھائی ہوئی ہیں اور قوموں کا ایک دوسرے پر دارومدار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد اور نظریہ بھی تاریخی رجحان کے خلاف نہیں رہ سکتا اور ہم کو بھی دنیاوی تعاون اور سچی بین الاقوامیت کے حق میں اپنی قومی تنگ نظری کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس لیے خود مختاری کے معنی ہمارے لیے

علیحدگی اختیار کرنے کے نہیں ہیں بلکہ سامراجی قابو سے آزادی حاصل کرنا ہے ۔ اور چونکہ یہ سامراجی طاقت آج ہندوستان میں برطانیہ کے روپ میں ہے لہٰذا ہم کو آزادی برطانیہ سے علیحدہ ہو کر ہی مل سکتی ہے ۔ ہمارا برطانوی جنتا سے کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن برطانوی سامراج میں اور ہندوستانی قوم پرستی میں کوئی مراعات کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں کبھی صلح ہو سکتی ہے اگر برطانیہ کے دماغ سے سامراجی کی بو نکل جائے تو ہم بڑی خوشی سے بین الاقوامی معاملات میں اس سے تعاون کریں گے ورنہ نہیں ۔

لیبر اور لبرل فریق کے برطانوی مدبر، ہم کو اکثر قومی تنگ نظری کی خرابیاں دکھلاتے ہیں اور برطانوی شہنشاہیت کی خوبیوں کا جس کو کہ اس مبالغہ آمیز زبان میں برطانوی قوموں کی دولتِ عام کہنے لگے ہیں تذکرہ کرتے ہیں ۔ وہ خوشنما الفاظ اور دل آویز جملوں کی چادر میں سامراجی حکومت کی وحشیانہ اور مہیب شکل کو چھپا دینا چاہتے ہیں اور ان کی یہی کوشش ہے کہ ہم اس کی جان لینے والی آغوش میں سوتے رہیں ۔ کچھ ہندوستانی بھی جنھوں نے قومی خدمت کی ہے (اور جن کو یہ بات سمجھنا چاہئے) بین الاقوامیت کی خوبیاں جس سے وہ برطانوی شہنشاہیت مراد لیتے ہیں سراہتے ہیں ۔ اور اس نادر چیز یعنی ڈومنین اسٹیٹس کے بجائے (جس کے دینے کا کسی نے کبھی جھوٹوں وعدہ بھی نہیں کیا) مکمل آزادی طلب کرنے پر ہماری تنگ خیالی کا اکثر گلہ کرتے ہیں ۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اہلِ برطانیہ کو یہ خاص قابلیت حاصل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی طبائع کو اپنی ذاتی منفعت کے سانچے میں ڈھال لیں یہ تو شاید غیر فطری نہیں ۔ لیکن حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہم وطن کس طرح ایسی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں ۔ جو لوگ کہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں ان کو تو آفتاب کی روشنی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا ۔ یہ بات مگر قابلِ غور ہے کہ بیرونی معاملات میں جو طرزِ عمل انگلستان کا رہا ہے اس نے بین الاقوامی تعاون کے راستے میں چاہے وہ لیگ آف نیشنز کے یا اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے تجویز کیا گیا ہو سب میں زیادہ روڑے اٹکائے ہیں ۔ تمام یورپ اور امریکہ کے لوگ اسے جانتے ہیں لیکن چونکہ ہم میں سے زیادہ تر غیر ملکی سیاسیات پر انگریزی آنکھوں سے نظر ڈالتے ہیں ۔ لہٰذا وہ ابھی اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچے ہیں انسداد

اصلحہ سازی۔ ہوائی بم بازی۔ منچوریا کی حکومت کا سوال۔ ان تینوں معاملوں میں جو انداز کہ انگلستان نے اختیار کیا وہ اس دعوے کا ثبوت ہیں۔ کیلاگ اور بریان کا پیرس والا عہدنامہ جس میں جنگ کا ارتداد کیا گیا تھا۔ وہ بھی جب تک کہ اپنی شہنشاہی مملکت کے متعلق کچھ ایسی شرطیں پڑھوا نہ لیں جن سے اس عہدنامہ کا اثر زائل ہو گیا انگلستان نے منظور نہیں کیا۔ برطانوی شہنشاہیت اور بین الاقوامیت میں قطبین کا فرق ہے اور اس شہنشاہیت میں رہ کر ہم کبھی بین الاقوامیت حاصل نہیں کر سکتے۔

اصل سوال جو اس وقت ہمارے سامنے بلکہ ساری دنیا کے سامنے ہے وہ نظام حکومت میں سیاسی، اقتصادی اور تمدنی اعتبار سے بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ صرف اسی طرح ہم ہندوستان کو ترقی کے راستے پر لا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور اس کی روز افزوں تباہی کا انسداد کر سکتے ہیں۔ ایسے انقلابی زمانے میں جیسا کہ آج کل دنیا میں ہے موجودہ نظام کو چلانے کا خیال دل میں لانا اور اس نیت سے اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا محض خیالِ خام ہی نہیں ہے بلکہ اپنی قوت کا ضائع کرنا ہے۔ ایسا کرنا اس موقع کو بھی ہاتھ سے کھونا ہے جو زندگی میں گھڑی گھڑی نہیں آتا اور جو تاریخ عرصہ دراز کے بعد صرف ایک بار دیتی ہے بقول مسولینی MUSSOLINI کے "آج ساری دنیا انقلاب میں ہے اور واقعات ہم کو ایسی زبردست طاقت سے دھکیل رہے ہیں کہ یہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ کوئی ثابت قدم نیت پس پردہ برسرکار ہے" افراد چاہے وہ کتنے ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہوں جب دنیا خود حرکت میں آتی ہے تو اس تبدیلی میں ان کا حصہ بہت تھوڑا سا رہ جاتا ہے۔ کہیں کہیں پر کسی حد تک وہ دھارے کا رخ تبدیل کر سکتے ہیں لیکن امنڈتی ہوئی موجوں کو روک نہیں سکتے۔ لہٰذا دنیا کو سکون نصیب ہونا اتفاقات زمانہ کے ہاتھ ہے اور انسانی طاقت سے باہر ہے۔

ہندوستان کدھر جا رہا ہے۔ یقیناً اس عظیم الشان انسانی مقصد کی طرف جہاں معاشرتی اور اقتصادی ہمواری کا رواج ہو گا جہاں ایک ملک دوسرے ملک پر جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ پر زبردستی نہ کر سکے گا۔ جہاں تمام دنیا کے ممالک کا

ایک متحدہ معاشرتی نظام ہوگا اور بین الاقوامی تعاون کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی قومی آزادی کی تصویر نظر آئے گی۔ جیساکہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں یہ محض خواب وخیال نہیں ہے۔ امروز اور مستقبل قریب کی عملی سیاسیات میں اس کی جھلک موجود ہے۔ ہم ممکن ہے کہ آج اس سے اپنی آنکھیں روشن نہ کرسکیں لیکن جن لوگوں کی نظریں دھندلی نہیں ہیں وہ اس درخشاں آفتاب کو افق پر نکلتا ہوا دیکھ سکتے ہیں اور اگر ہم کو منزل مقصود تک پہنچنے میں کچھ دیر بھی لگے تو بھی ہمیں اس کا کوئی غم نہیں۔ جب تک کہ ہمارے قدم صحیح راستے پر پڑیں اور ہماری نگاہیں برابر سامنے کی طرف ہیں۔ کیونکہ کسی بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قدم بڑھانا خود اپنی جگہ پر ایک خوشی اور راحت ہے، اور ایک حد تک کامیابی بھی۔ بقول برنارڈ شا BERNARD SHAW "دنیا کی سچی خوشی یہی ہے کہ کسی ایسے مقصد میں جو بلند ہو، کام آنا اور پیشتر اس کے کہ جنس ناکارہ کی طرح گھورے پر پھینکے جانے کی نوبت آئے اپنے دل ودماغ کی ساری قوتیں صرف کرکے بالکل شل اور چور ہوجانا۔ اور بجائے ایک مجموعہ آلام ومصائب بن کر جڑ پڑے رہیں اور خودغرضی سے دنیا کی عدم توجہی کی شکایت کرنے کے خود قدرت کی ایک طاقت بن جانا۔

---

# سر محمد اقبال کے سوالوں کا جواب

میں نے سر محمد اقبال کا بیان جو انھوں نے اخباروں میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے بڑے غور سے پڑھا انھوں نے نہایت صاف گوئی اور خوش اخلاقی سے کام لیا ہے اور مجھ سے اپنے سوالات کا جواب مانگا ہے۔ میں بڑی خوشی سے ان کی دعوت قبول کرتا ہوں۔ لیکن میں پہلے دوسری گول میز کانفرنس کے اس واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف سر محمد اقبال نے اشارہ کیا ہے اور جو فرقہ وارانہ مصالحت کی گفتگو کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا ہوں۔ لیکن جو لوگ اس واقعے کو مجھ سے زیادہ اچھی طور سے جانتے ہیں وہ ان غلط فہمیوں کو جو ممکن ہے کہ آپس میں پیدا ہو گئی ہوں ضرور رفع کر دیں گے۔ اور جب سر محمد اقبال گاندھی جی کی کسی شرط کو خلافِ النسا بنت قرار دیتے ہیں تو مجھے پورا یقین ہے کہ ان کو کوئی زبردست غلط فہمی ہوئی ہے۔

سر محمد اقبال فرماتے ہیں کہ گاندھی جی ذاتی حیثیت سے گول میز کانفرنس کے مسلمان نمائندوں کے مطالبات ماننے کے لیے تیار تھے۔ لیکن وہ یہ وعدہ نہیں کرتے تھے کہ کانگریس بھی ان مطالبات کو تسلیم کر لے گی۔ مجھے تو یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ گاندھی جی یا ان کی جگہ کوئی اور شخص اس کے علاوہ کوئی دوسرا طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا تھا کم سے کم کسی جمہوری انجمن کا کوئی نمائندہ اس کے خلاف ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ کانگریس کی مجلسِ انتظامیہ بھی کانگریس کی تجاویز کو رد نہیں کر سکتی۔ وہ ایسا مسئلہ یا تو آل انڈیا

کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کر سکتی ہے یا کانگریس کے اجلاسِ عام میں پھر سے اٹھا سکتی ہے جس کا فیصلہ ناطق ہو سکتا ہے۔ کانگریس کے عام رجحان کے علاوہ یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک کافی بڑی جماعت خصوصاً قوم پرست مسلمان ان میں سے چند مطالبات کے خلاف تھے گاندھی جی انگلستان جانے سے پہلے بار بار کہہ چکے تھے کہ وہ اس مسئلہ پر ڈاکٹر انصاری کے فیصلے کو مسلم قوم پرستوں کی رائے تسلیم کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مسلمانوں کی دونوں جماعتیں آپس میں کوئی تصفیہ کرلیں گی تو وہ فوراً بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُسے قبول کرلیں گے۔ انھوں نے اسی لیے کہ ایسا تصفیہ ہونے میں آسانی ہو گھڑی گھڑی اس بات پر زور دیا کہ ڈاکٹر انصاری گول میز کانفرنس میں بطور ڈیلی گیٹ کے بلائے جائیں لیکن مسلمان نمائندوں نے ہمیشہ شد و مد سے اس کی مخالفت کی۔ باوجود ان سب باتوں کے آخر کار سمجھوتے کی کوئی شکل نکالنے کے لیے گاندھی جی نے یہاں تک کیا کہ اپنے آپ کو ذاتی طور پر پابند کرلیا۔ حالانکہ وہ کانگریس کو پابند نہیں کر سکتے تھے پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ ان کی رائے اور وکالت کانگریس کا مزاج تبدیل کرنے میں کتنی زبردست طاقت ہوتی۔

دوسری شرط جو کہا جاتا ہے کہ گاندھی جی نے کی وہ یہ تھی کہ مسلم نمائندے اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی تائید نہ کریں۔ اسی کو سر محمد اقبال خلافِ انسانیت قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کے معنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اچھوتوں کو ہمیشہ مجبور اور پامال رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب نتیجہ انھوں نے اخذ کیا ہے۔ اگر گاندھی جی کو دل سے کسی بات کی لگی ہے تو وہ یہی ہے کہ اچھوت اچھوت نہ رہیں۔ ان کے حقوق یا اختیارات زائل نہ کیے جائیں۔ ان پر کسی قسم کی رکاوٹیں یا بندشیں نہ رکھی جائیں اور وہ دوسری جماعتوں کے مدمقابل سمجھے جائیں۔ وہ تو اس کے مخالف محض اس وجہ سے تھے کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر اچھوتوں کی علیحدہ ایک جماعت قائم کی جائے گی تو وہ ہمیشہ کے لیے داغی ہو جائیں گے اور ان کا دوسری جماعتوں میں ملنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ یہ بات تو سب کو بخوبی معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں کچھ اقلیتوں کے

نمائندوں اور کنزرویٹوز CONSERVATIVES میں ایک طرح کا اتحاد قائم کیا گیا تھا۔ گاندھی جی اسی واسطے مسلم نمائندوں سے یہ چاہتے تھے کہ وہ اچھوتوں کی علیحدہ جماعت بنائے جانے کی تائید نہ کریں۔ جہاں تک مجھے علم ہے انھوں نے اچھوتوں کی مخصوص یا مزید نمائندگی کے خلاف اپنی آواز کبھی بلند نہیں کی۔ برخلاف اس کے ان کی تو یہ رائے ہے کہ ان کو ہر امکانی مدد دی جانی چاہیے تاکہ وہ دیگر ترقی یافتہ گروہوں یا قوموں کے ہم دوش آ سکیں۔ بعد کے واقعات نے یہ دکھایا ہے کہ وہ اس راستے میں کہاں تک قدم بڑھانے کو تیار ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں اشتراکیت کا دلدادہ ہوں مجھے ان دلیلوں میں کوئی نقص یا خامی نظر نہیں آئی۔

سر محمد اقبال کو گاندھی جی کے اس طرزِ عمل پر غالباً شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی دغابازی کی چال ہے۔ وہ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ گاندھی کو اچھوت اودھار کی اتنی فکر نہیں ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اچھوت اور جماعتوں سے خصوصاً مسلمانوں سے (یہ میرا خیال ہے) مل نہ سکیں۔ کسی بلاوجہ شک کا مٹانا یا خواہ مخواہ کی بدظنی دور کرنا بہت مشکل بات ہے لیکن جو شخص کہ گاندھی جی کو تھوڑا بہت بھی جانتا ہے وہ بھی اس خیال کو کہ وہ ہریجنوں کی خدمت سیاسی اغراض سے کر رہے ہیں مہمل قرار دے گا۔ ذاتی طور پر مجھے ان مذہبی سرناموں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد مٹ جائیں گے یا کم از کم ان کی کوئی سیاسی وقعت باقی نہ رہے گی سر محمد اقبال غالباً ابھی تک انھیں سیاسی اہمیت دیتے ہیں۔ گاندھی جی جہاں تک مجھے علم ہے ایسا نہیں کرتے لیکن وہ صاحب ایمان ضرور ہیں اور وہ ہندو دھرم کی بنیادی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ان ہی بنیادی باتوں کو رائج کرنا چاہتے ہیں اور ان غیر ضروری چیزوں کو جو ان میں شامل ہو گئی ہیں یک قلم مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ چونکہ کسی فرقے کے اچھوت قرار دیے جانے کو اسی قسم کا ذلیل اور قابلِ نفرت اضافہ سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں۔ یہ کہنا تو بالکل غلط ہے کہ وہ اچھوتوں کا اونچی ذات والے ہندوؤں میں مل جانا نہیں چاہتے۔ یوں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ

ہندوستان کی ساری قومیں آپس میں گھل مل جائیں لیکن سر محمد اقبال کی طرح وہ بھی تہذیب کے چند بنیادی اصولوں کے دلدادہ ہیں جن کو وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبوں کو بھی مکمل آزادی دینا چاہتے ہیں۔

میرا ذاتی نظریہ مختلف ہے۔ اس پر مذہب کا رنگ نہیں چڑھا ہے اور میرے لیے مذہبی اعتبار سے مختلف جماعتوں پر نظر ڈالنا بہت دشوار ہے لیکن سر محمد اقبال کا غالباً یہی نظریہ ہے اور وہ خیال کے موجودہ رجحانات کی طرف سے اپنی نگاہیں پورے طور پر پھیرے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ مذہب میں نسل اور تہذیب کا سوال بھی لے آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں علم الحیات کی رو سے ایک دلیل پیش کی جس کو میں مطلق سمجھ نہ سکا۔ گاندھی جی کو ایک طرف تو ان فرضی کوششوں پر جو انھوں نے اچھوتوں کو دوسری قوموں سے ملنے سے روکنے کے لیے کیں گنہگار قرار دیا۔ اور دوسری طرف خود اپنی رائے یہ دی کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کا گھل مل جانا محض خواب و خیال ہے اور اس کا جلد سے جلد دماغ سے نکال دینا ہی بہتر ہے۔

آیا علم الحیات کی رو سے ہندوستان کی مختلف جماعتیں آپس میں گھل مل سکیں گی یا نہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس میں بہت سی تنقیحیں پیدا ہوتی ہیں جو علم نسلیات EUGENIES یا تہذیب کی نظر کے لیے مخصوص طور پر قابل توجہ ہو سکتی ہیں۔ یہ دراصل کوئی سیاسی امر نہیں ہے اور موجودہ زمانے والے اس میں محض برائے بحث دلچسپی لے سکتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس طرح شیر و شکر ہونا ہمارے لیے لازمی ہے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کب تک ایسی صورت رونما ہوگی۔

لیکن اس مسئلہ کا فرقہ وارانہ سوال سے کیا تعلق ہے؟ کیا مسلمانوں، سکھوں، یا ہندوستانی عیسائیوں کے مذہبی گروہوں میں اور ہندوؤں کی جماعت میں علم الحیات کی رو سے کوئی فرق ہے؟ کیا ہم مختلف اقسام کے جانور ہیں یا ایک ہی قسم کے مختلف نمونے؟ نسل اور تہذیب کے اختلافات تو ہیں لیکن ان کا مذہبی تفریق سے کوئی

واسطہ نہیں ۔ بلکہ یہ اختلافات تو مذہبی حدود کو بیچ سے توڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں
اگر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرے تو نہ تو اس کی نسلی خصوصیات میں فرق آتا ہے
نہ اس کی حیوانی ساخت پر اثر پڑتا ہے اور نہ اس کی تہذیب کا پس منظر کافی طور
پر مٹایا جاسکتا ہے ۔ تہذیب قومیت سے اثر پذیر ہوتی ہے نہ کہ مذہب سے ۔ اور
موجودہ کیفیاتِ زمانہ تو ایک ایسا طبقہ پیدا کررہی ہیں جس کی تہذیب کو بین الاقوامی کہا جا
سکتا ہے ۔ گزشتہ زمانے میں بھی مختلف تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا
ہے اور مشترک تہذیبوں کی بھی بنیاد ڈالی ہے لیکن عام طور پر اخلاق وعادات پر
قومی رنگ غالب رہا ہے ۔ ان ممالک میں جہاں اپنی ذاتی پرانی تہذیب موجود
تھی ایسا ضرور ہوا ۔ چنانچہ ہندوستان ایران اور چین اسی کی مثالیں ہیں ۔

اسلامی تہذیب آخر کیا چیز ہے ؟ کیا اس سے قبیلہ بنو ہاشم کی عربی تہذیب مراد
لی جائے یا قوم آریہ کی ایرانی تہذیب سمجھی جائے یا دونوں کا مجموعہ ؟ عربی تہذیب
تو ایک شاندار دور کے بعد نظر سے اوجھل ہوجاتی ہے لیکن اپنے کامیاب ترین عہد
میں بھی ایرانی تہذیب سے متاثر رہی ہے ۔ ہندوستان میں تو اس کا شاید ہی کوئی
نشان ہو ۔ ایرانی تہذیب تو درحقیقت تبلیغ اسلام سے بہت پیشتر کی ہے اور اس
پرانی ایرانی تہذیب اور رسم کا ہزارہا سال تک قائم رہنا تاریخ کا ایک بہت
عجیب وغریب سبق ہے ۔ آج بھی ایران اپنی تہذیب کے نقوش تازہ کرنے کے لیے
اسی پرانے زمانے کی طرف نگاہیں ڈال رہا ہے ۔ اسی ایرانی تہذیب نے یقیناً
ہندوستان پر اثر ڈالا اور خود بھی اثر پذیر ہوئی ۔ لیکن حدودِ ہندوستان میں تو
ہندوستانی تہذیب ہی غالب رہی اور باہر سے آنے والوں کو اس نے رفتہ رفتہ اپنے
رنگ میں رنگ لیا ۔

آج ہندوستان کے ہندو اور مسلم عوام میں نہ تو کوئی نسل کا فرق ہے اور نہ تہذیب کا
شمالی ہندوستان کے اونچے طبقوں کے ان چند مسلمانوں میں بھی جو شاید اپنے آپ کو ملک سے
علیحدہ سمجھتے ہیں اس ہندوستانی تہذیب کے نقش ونگار کافی ابھرے ہوئے نظر آرہے

ہیں اوران کی ایرانیت محض نمائشی ہے ان میں سے کسی کو اگر ایران، عرب ترکی یا کسی دوسرے اسلامی ملک میں بود و باش اختیار کرنی پڑے تو کیا اسے زندگی سے زیادہ ہم آہنگی میسر ہوسکتی ہے یا اسے زیادہ گھر کا سا آرام حاصل ہوسکتا ہے؟

دراصل اس سوال کی محض تاریخی اور مکتبانہ دلچسپی ہے کیونکہ موجودہ صنعتی دنیا کی تیز رفتاری اور مختلف قوموں کے متواتر اور پے در پے میل جول سے ایک نئی بین الاقوامی تہذیب رونما ہو رہی ہے جو تمام قوموں کی تہذیبی حدود توڑ رہی ہے اوران کے نقوش مٹاتی چلی جارہی ہے۔ کیا سر محمد اقبال جو کچھ وسطی ایشیا، ترکی، مصر اور ایران میں ہو رہا ہے اس پر صاد کرنے کو تیار ہیں؟ یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ان طاقتوں کا جو کہ اسلامی ممالک کی صورت تبدیل کیے دے رہی ہیں کوئی اثر نہ پڑے گا۔ وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں لیکن دنیا کی طاقتیں تو اس پرانے اور فرسودہ کھنڈر کو گراتی ہی چلی جائیں گی اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت ضرور کھڑی کریں گی۔ میں بذاتِ خود اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ ساری دنیا ایک ہی نمونے پر تعمیر کر دی جائے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ دنیا کی تمام مختلف تہذیبیں رفتارِ زمانہ سے موافقت کرتے ہوئے بھی اپنے اپنے بیش بہا خزانے جو انھیں وراثت میں ملے ہیں تلف نہ ہونے دیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے مجھے محض یقین ہی نہیں کہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم بن سکتی ہے بلکہ باوجود لاتعداد ظاہری اختلافات کے میرا خیال ہے کہ آج بھی اس کی بنیادیں موجود ہیں۔ موجودہ فرقہ وارانہ مسئلہ محض مختلف فرقوں کے اعلیٰ طبقے کے گروہوں کا تیار کردہ سیاسی معمہ ہے اور اس سے نہ تو نسلی اور تہذیبی معاملات سے کوئی تعلق ہے اور نہ عوام کی اصلی ضروریات سے کوئی مناسبت ہے۔

اب میں سر محمد اقبال کے اس صاف سوال کا جو انھوں نے مجھ سے کیا ہے جواب دیتا ہوں۔ میرے اور ان کے نظریے میں بڑا فرق ہے اور میں مذہبی اکثریت اور اقلیت کی زبان میں مشکل سے گفتگو کرسکتا ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ میں کچھ کہوں اور وہ کچھ اور سمجھیں لہٰذا میں الفاظ کو ان ہی مفاہیم میں استعمال کرنے کی کوشش کروں گا جن میں سر

محمد اقبال صرف کر چکے ہیں۔

میں کسی ایسے اہم مسئلہ کا فیصلہ جس کا تعلق ہندوستان یا ہندوستان والوں سے ہو کسی بیرونی ثالث کے ہاتھ میں چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں خصوصاً اس سامراجی طاقت کے ہاتھ میں جو ہم پر حکومت کر رہی ہے اور ہمارے اختلافات اور خامیوں سے پورے طور پر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ اکثریت کو چاہیے کہ وہ اقلیت کے ان حقوق کو جو اس کی پناہ اور حفاظت کے لیے کم سے کم ضروری ہیں تسلیم کرلے۔ لیکن یہ کم سے کم حقوق کیا ہیں! اور ان کا فیصلہ کرنے والا کون ہے! ایک اقلیت خود؟ عام طور پر میں یہ بھی ماننے کے لیے تیار ہوں گو یہ ممکن ہے کہ کچھ ایسے معاملات جو قومی زندگی کے لیے نہایت اہم ہیں مستثنیٰ کرنا پڑے۔ بالفعل ہم ان مستثنیات کو خارج از بحث کرتے ہیں۔ ہاں پھر یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ اقلیت دراصل کیا چاہتی ہے؟ کیا کسی ایسے چھوٹے گروہ کی جو اپنے آپ کو اس اقلیت کا نمائندہ ظاہر کرتا ہو رائے مان لی جائے! اور جب ایسے کئی ایک گروہ ہوں تب کیا کیا جائے؟ مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس دونوں جماعتوں میں سے کوئی نہ تو جمہوری ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کا۔ اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ان کے مطالبات کے مخالف ہے۔ مسلم لیگ کی کونسل (ظاہراطور پر تو یہ ایک ہوائی چیز معلوم ہوتی ہے جس کا کسی جسم سے تعلق نہیں) محض چند ایسے افراد کا گروہ ہے جو قریب قریب مستقل ہے اور جو یا تو اپنا انتخاب خود کر لیتے ہیں یا گھڑی گھڑی اپنے آپ کو نامزد کر دیتے ہیں۔ مسلم کانفرنس کی تنظیمی صورت بھی ایسی رکھی گئی ہے کہ وہ سرکاری آئین ساز مجالس کے مسلمان ممبروں کے زیر اثر ہے۔ یہ جماعتیں مسلمانوں کی نمائندگی کی دعویدار کس طرح بن سکتی ہیں خصوصاً مسلم عوام کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ یہ کبھی کبھی کسی مروج خیال یا عام جذبے کی ترجمانی کر دیا کریں۔ پھر کیا وہ گروہ بھی جس کو حکمران سامراجی طاقت نے مسلم عوام کا نمائندہ انتخاب کر کے گول میز کانفرنس میں بھیجا قابلِ توجہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ بڑی قابلِ قدر ہستیاں ہوں لیکن یقیناً ان کی نمائندوں

کی حیثیت نہیں۔

یہ جاننے کے لیے کہ ہندوستان کے مسلمان کیا چاہتے ہیں ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سے ان کے دل کی بات پوچھی جائے۔ اس بات کے دریافت کرنے کا جمہوری طریقہ تو یہی ہے کہ وہ خاص اس امر کے لیے اپنے نمائندے جس قدر کثیر التعداد رایوں سے ممکن ہو سکے چنیں۔ بہتر تو یہی ہوگا کہ ہر جوان العمر کی رائے لی جائے اور اس طرح سے جو فیصلہ وہ کریں گے میں اس کو قبول کرنے کو پورے طور پر راضی ہوں۔

میں سر محمد اقبال سے یہ بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنی چودہ شرائط پر جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کم سے کم ضرور سمجھی جاتی ہیں ایک نظر ڈالیں اور اگر ان میں کوئی ایسی چیز ہو جس سے مسلم عوام کی ترقی یا بہبودی کی گنجائش ہو تو وہ مجھے بتائیں۔ یہ تو وہ جانتے ہیں کہ سیاسیات سے میری خاص دلچسپی صرف یہی ہے کہ عوام کی ترقی ہو اور جو حد بندیاں کہ دولت اور درجہ کی ہماری معاشرت میں موجود ہیں وہ مٹا کر ایک تمدنی ہمواری قائم کی جائے۔ لیکن غالباً نہ تو ان شرائط کے بنانے والوں نے نہ کبھی ان کے پیش کرنے والوں نے اس نقطۂ نظر سے ان پر غور کیا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ میں ان کا بہت پرجوش خیر مقدم نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی اگر مسلمان اس جمہوری طریقے سے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں یہی مطالبات پیش کریں تو میں انہیں تسلیم کر لوں گا اور مجھے کامل یقین ہے کہ مجموعی طور پر ملک بھی انھیں قبول کرے گا۔ مگر میرا یہ خیال ضرور ہے کہ جب مسلم عوام کی رائے لی جائے گی تو وہ بہ نسبت ان مطالبات کے جو محض چند اونچے طبقے والوں سے وابستہ ہیں ان اقتصادی مطالبات پر جن کا ان کی نیز غیر مسلم عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے کہیں زیادہ اصرار کریں گے۔

ہندوستان کا سیاسی مسئلہ ہندوستان والے ہی بغیر کسی بیرونی طاقت کے دخل دیئے ہوئے حل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح فرقہ وارانہ سوال بھی طے کیا جا سکتا ہے اور دونوں کے حل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ عوام سے جواب طلب کیا جائے۔ سیاسی مسئلہ کا تصفیہ صرف ایک ایسی مجلسِ شوریٰ کر سکتی ہے جس کا انتخاب ہر جوان العمر یا قریب ہر

ہر جوان العمر کی رائے سے ہوا ہو۔ میں ذاتی طور پر تو اس کے لیے بھی تیار ہوں کہ اقلیتوں کو اگر وہ چاہیں تو اپنے نمائندے اپنی مخصوص جماعت کی رائے سے منتخب کرنے کا حق دیا جائے ان نمائندوں کو اس اقلیت کی طرف سے جس نے ان کو منتخب کیا ہے بولنے کا پورا پورا حق ہوگا اور کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ ان کے انتخاب میں اکثریت کا کوئی ہاتھ ہے۔ یہ لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ پر غور کریں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں ان مسلمان نمائندوں کا مطالبہ تسلیم کرلوں گا۔

سر محمد اقبال اس بات کو ملاحظہ فرمائیں گے کہ میں ان کے سامنے اس مسئلہ کے حل کرنے کا ایک ایسا طریقہ پیش کر رہا ہوں جو کہ جمہوری بھی ہے اور جس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں تو کانگریس کو بھی اس سے بالکل علیحدہ کیے دے رہا ہوں مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو کانگریس خوشی سے دور کھڑی ہو جائے گی اور اس میں کوئی دخل نہ دے گی۔

اس لیے میری طرف سے سر محمد اقبال کے سوال کا جواب یہ ہے۔ میرے نزدیک محض وہی دو طریقے نہیں ہیں جن کا ذکر انھوں نے کیا ہے بلکہ اور بھی راستے ہیں۔ بہرحال یہ ان کو بخوبی جاننا چاہیے کہ اگر کوئی فرقہ چھوٹا یا بڑا سامراجی حکومت سے اتحاد عمل کرے گا تو اس کو ہندوستانی قومیت کی سخت مستقل اور پیہم مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دراصل ایسا تو کوئی ملت یا اقلیت کر ہی نہیں سکتی ہے۔ صرف چند سربرآوردہ افراد یا کچھ اونچے طبقے کے لوگ ایسا کر سکتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ہر ملت اس سے نقصان اٹھا رہی ہے۔ عوام سامراجی حکومت سے کبھی کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے لیے تو اس کی بندشیں توڑنا ہی صرف ایک راہِ نجات ہے۔

میں ہندوستان کو مذہبی طور پر تقسیم کرنے کا بھی قائل نہیں ہوں۔ ایسے فرق پیدا کرنا نہایت نامناسب ہیں اور موجودہ دنیا میں ان کی کوئی گنجائش نہیں لیکن میں اس کے مخالف نہیں ہوں کہ موجودہ صوبوں کی ساخت اور شکل تبدیل کر دی جائے تاکہ خاص گروہوں کو اپنی تہذیب کو ترقی دینے کا پورا موقع ملے۔

# قید خانے کی دنیا

ایک انگریزی رسالے کے کسی حال کے پرچے میں ایک مضمون نگار یہ لکھتے ہیں کہ سیاست کی کشاکش اور جیل خانے کی زندگی کی سختیوں نے مجھے بالکل توڑ دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کی اطلاع کے ذرائع کیا تھے لیکن اس اندرونی واقفیت کی بنا پر جو کہ اپنے جسم اور دل و دماغ کے بارے میں مجھے کافی طور پر حاصل ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کافی مضبوط اور تندرست ہیں اور ان میں سے کسی کے عنقریب بگڑنے یا بے کار ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے میں نے اپنی صحت کو ہمیشہ اہم سمجھا اور گو کہ اکثر میں اپنی تندرستی کا کافی خیال نہ رکھ سکا پھر بھی یہ نوبت کہ میں بیمار ہو جاؤں بہت کم آئی دماغی صحت تو کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہے لیکن میں نے اس کی بھی کافی نگہداشت کی ہے اور ایک حد تک میں یہ سمجھتا ہوں (ممکن ہے کہ یہ محض شیخی ہو) کہ یہ شئے لطیف بھی میرے پاس بہت سے ایسے لوگوں کے مقابلے میں جنھوں نے سیاسی میدان میں نہ کبھی قدم رکھا ہے اور نہ کبھی دور سے بھی جیل خانے کا دروازہ دیکھا ہے کہیں زائد ہے۔

لیکن میری تندرستی یا بیماری تو ایک ایسی چھوٹی سی بات ہے جس پر کسی کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے حالانکہ میرے دوستوں اور اخباروں نے اسے غیر ضروری اہمیت دیدی ہے۔ قومی اور اخلاقی اعتبار سے جو بات کہ اس سے کہیں زیادہ اہم ہے وہ ان جیل خانوں کی حالت اور فضا ہے اور یہاں کے لاتعداد رہنے والوں کے مجموعی طور پر دلی اور دماغی تاثرات ہیں۔ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ بہت سے بہادر

مضبوط آدمی جیل کی سختیاں برداشت نہ کر سکے اور یہاں تک ہوا کہ بند رہتے رہتے ان کی صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ میں نے اپنے قریب ترین اعزاء کو جیل خانے کی تکلیفیں سہتے دیکھا ہے اور میرے دوستوں کی فہرست تو بہت لمبی اور دردناک ہے حال ہی میں جے، ایم، سین گپتا ایک ذی قدر رفیق جو میرا پچیس سال کا ملاقاتی اور دوست تھا اور جس سے میں پہلے پہل کیمبرج CAMBRIDGE میں ملا تھا اور جو اس بدنصیب ملک کے بہادروں میں بھی بہادر شمار کیا جاتا تھا اس قید کی تاب نہ لا سکا اور جیل خانے ہی میں موت کا شکار ہوا

یہ قدرتی بات ہے کہ ہمیں اپنے جاننے والوں اور ساتھیوں کی تکلیف اور مصیبت کا احساس ان ہزاروں مصیبت زدوں کے دکھ درد کے مقابلے میں جن سے ہم واقف نہیں ہیں زائد ہوتی ہے۔ پھر بھی میں جو کچھ اس وقت لکھ رہا ہوں یہ اپنے دوستوں کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں۔ ہم میں سے جو لوگ کہ اپنی خوشی اور مرضی سے اس بھیانک آہنی دروازے کو پار کر کے اندر داخل ہوئے ہیں ان کی کوئی نیت اس برتاؤ کے خلاف جو یہاں ان کے ساتھ کیا جاتا ہے کسی قسم کا شکوہ یا شکایت کرنے کی نہیں ہے۔ اگر ہمارے کچھ ہم وطنوں کو اس مسئلہ میں دلچسپی ہے یا یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں تو یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف اپنی آواز بلند کریں ایسے سوال جب کبھی اٹھائے جاتے ہیں تو عام طور پر وہ کسی خاص مشہور شخص کا نام لے کر اٹھائے جاتے ہیں اور اس کے دنیاوی اقتدار کا حوالہ دے کر مخصوص رعایت کا سوال کیا جاتا ہے۔ اس شورش کو مٹانے کے لیے گنتی کے چند آدمیوں کو ' اے ' یا ' بی ' کلاس دے دیا جاتا ہے لیکن قیدیوں کی بہت بڑی جماعت کو جو کہ غالباً بچانوے فی صدی سے بھی زائد ہے جیل خانے کی زندگی کی پوری سختیاں بھگتنی پڑتی ہیں۔

قیدیوں کی اس درجہ وار تفریق پر اکثر اعتراضات کئے گئے ہیں اور یہ اعتراضات حق بجانب ہیں۔ یہ تفریق کسی حد تک حفظان صحت کے اصول پر جائز قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ جن لوگوں کو دوسرے قسم کا کھانا کھانے کی عادت ہے اگر ان کو جیل خانے میں عام کھانا کھانے کو دیا جائے تو وہ یقیناً کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو جائیں گے چنانچہ

اس کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ جسمانی طور پر سخت محنت اور مشقت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ 'سی' کلاس والوں کو وہ مخصوص حقوق نہ دینے کی جو کہ 'اے' اور 'بی' کلاس والوں کو حاصل ہیں مشکل ہی سے کوئی وجہ سوچی جاسکتی ہے۔ اونچا درجہ اس شخص کو دیا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص زیادہ ذی حیثیت ہے یا جس کو زیادہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ کوئی شخص ذی حیثیت ہے کہ نہیں ایک رائج طریقہ یہ ہے کہ جو رقم وہ بطور مالگذاری کے دیتا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص زیادہ مالگذاری دیتا ہے اس کو اپنے بیوی بچوں سے زیادہ محبت ہے اور اس لئے اس کو خط بھیجنے اور ملاقات کرنے کی زیادہ ضرورت ہے؟ کیا اس کے دماغ کی بے چینی کچھ زیادہ ہے یا اس کا دل زیادہ گھبراتا ہے جس کی تسکین کے لیے اس کو لکھنے پڑھنے کی زیادہ آسانیاں ملنی چاہئیں۔ جو لوگ کہ بڑی بڑی رقمیں مالگذاری میں دیتے ہیں عام طور پر دماغی اوصاف یا ذہنی بلندی کی تہمت ان پر نہیں لگائی جاسکتی۔

میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن لوگوں کو یہ مخصوص حقوق حاصل ہیں وہ ان سے چھین لیے جائیں۔ یہ حقوق ہیں ہی کیا جو کوئی ان کو چھینے۔ ہم کو خیال رکھنا چاہیے کہ اور ملکوں میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ قیدی کے بھی حقوق یہاں کے اے کلاس کے قیدی سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ اے اور بی کلاس کے حقوق بھی اس قدر معدودے چند لوگوں کو دیے جاتے ہیں کہ اس ملک کے جیل خانوں کی زندگی پر مجموعی نظر ڈالنے کے وقت یہ آسانی سے فروگذاشت کیے جاسکتے ہیں۔ دراصل قیدیوں کو 'اے' اور 'بی' درجہ عطا کرنا محض پبلک شورش رفع کرنے کے لیے ایک خواب آور دوا ہے۔ اکثر لوگ جو اصل واقعات سے واقف نہیں وہ اس فریب میں آجاتے ہیں۔

چند 'اے' کلاس کے قیدیوں کو اور خاص طور پر کچھ ڈٹینوز DETENUOS یا سرکاری قیدیوں کو اکثر ایک خاص مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کو بغیر کسی ساتھی کے مہینوں تک اکیلا رکھا جاتا ہے اور یہ تو ہر ڈاکٹر جانتا ہے کہ ایسی تنہائی ایک معمولی انسان کے لیے نہایت درجہ مضر ہے۔ یہ تو محض چند آدمی ہیں جنھوں نے اپنے دماغوں کو ایسی تعلیم اور

تربیت دی ہے جو محض اپنے خیالوں کو رفیقِ حیات بنا سکتے ہیں اور اس طرح اس تنہائی کے برے اثرات سے بچ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے قیدی یا ڈٹنوز DETENUOS سے جیل کے کسی افسر سے روزانہ چند منٹ گفتگو کرنے کا موقع دیا جاتا ہے لیکن اس رعایت کا خوشی خوشی کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ یہ قیدِ تنہائی کا اصول حکومت نے ظاہرا طور پر جان بوجھ کر کسی مصلحت کی بنا پر رکھا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب میں گرفتار کیا گیا تھا اسی زمانے میں پشاور یا چرسادا میں خان عبدالغفار خان بھی پکڑے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب، ڈاکٹر خان صاحب کا ایک جوان بیٹا اور ایک ان کا ساتھی۔ یہ چاروں آدمی ساتھ ہی ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ یہ سب ایک اسپیشل ٹرین میں لائے گئے تھے۔ اور چار مختلف شہروں میں الگ الگ جیل خانوں میں بند کیے گئے تھے۔ ان سب کا ایک جگہ رکھنا یا کم سے کم باپ بیٹے کا یا بھائی بھائی کا ساتھ رکھنا بالکل آسان بات تھی لیکن مصلحتاً ایسا نہیں کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص بغیر کسی ساتھی کے الگ الگ بند کیا گیا۔ کم سے کم ڈاکٹر خان صاحب کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ وہ اس طرح نینی جیل میں رکھے گئے۔ ایک مہینے سے زائد میں بھی نینی جیل میں تھا لیکن ہم لوگ الگ الگ رکھے جاتے تھے اور ملنے کی اجازت نہ تھی مجھے یہ بات خاص طور پر ستاتی تھی کیونکہ خاں صاحب میری ولایت کی طالب علمی کے زمانے کے لنگوٹیے یار تھے اور میں ان سے برسوں سے نہ مل سکا تھا۔

جو سوال میں نے اٹھایا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ رعایتی سلوک ہونا چاہیے میں بخوبی جانتا ہوں کہ یہ برتاؤ روز بروز برا ہی ہوتا جائے گا جس کا کہ پچھلے بارہ سال کے تجربے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کو صرف پبلک کا مطالبہ روک سکتا ہے لیکن آخر میں اس کی بھی زیادہ وقعت نہیں ہوتی جب تک کہ یہ اتنا ہی پُرزور اور قوی نہ ہو کہ اس کی کامیابی یقینی ہو اور یہ رد نہ کیا جا سکے۔

لہٰذا یہ بات تو ظاہر ہے کہ سیاسی قیدیوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بتدریج بدتر ہی ہوتا چلا جائے گا۔ ۱۹۳۰ء لغایت ۱۹۳۲ء میں جو

برتاؤ تھا وہ ۱۹۲۱ء لغایت ۱۹۲۲ء کے مقابلہ میں زیادہ بُرا تھا اور ۱۹۳۲ء کا اور بھی زیادہ خراب تھا۔ آج جیل خانے میں ایک معمولی سیاسی قیدی کی زندگی ایک غیر سیاسی قیدی کی زندگی کے مقابلے کہیں زیادہ سخت ہے۔ ہر امکانی کوشش اس کو ستانے کی کی جاتی ہے تاکہ وہ معافی مانگ لے یا کم سے کم اتنا پریشان ہو جائے کہ پھر جیل خانے آنے کا بھولے سے بھی خیال نہ کرے۔

سر سیمول ہور SIR SAMVEL HOARE کی طرف سے ہاؤس آف کامنز HOUSE OF COMMONS میں یہ بیان دیا گیا ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں پانچ سو سے زائد آدمیوں کو ہندوستان میں کوڑے مارے گئے۔ ایک ملک کی تہذیب کا اکثر اس بات سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آیا وہاں سزائے تازیانہ رائج ہے کہ نہیں بہت سی ترقی یافتہ سلطنتوں میں تو اس کا نام بھی نہیں ہے اور جن حکومتوں میں یہ ابھی کلیتاً منسوخ نہیں کی گئی ہے وہاں یہ محض نہایت ذلیل، وحشیانہ اور جابرانہ جرائم (مثلاً ایک کم عمر لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر وغیرہ) کے لیے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہے کہ چند ماہ ہوئے جب اسمبلی میں اس بات پر مباحثہ بھی ہوا تھا کہ اس سزا کا چند غیر سیاسی جرائم کے لیے رکھنا مناسب ہے کہ نہیں۔ حکومت کے طرفداروں نے یہ تقریریں کی تھیں کہ چند مخصوص وحشیانہ جرائم کے لیے اس کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ غالباً ہر شخص جس نے انسان کے دماغ کا جائزہ لیا ہے یا جو ماہر نفسیات ہے اس کی رائے اس کے خلاف ہے کیونکہ وحشیانہ سزا دے کر وحشیانہ جرائم کے انسداد کی کوشش کرنے سے بڑھ کر زیادہ حماقت آمیز کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس کے ہمارے ملک میں یہ آئے دن کی بات ہے کہ جیل خانے کی معمولی سے معمولی قواعد شکنی پر یا محض کتابی تعریف والے سیاسی جرائم پر جن میں کسی قسم کی اخلاقی بدعنوانی کا شائبہ بھی نہیں بے چارے مجرموں کو بیت لگائے جاتے ہیں۔

لیکن ہماری عورتوں کو جیل خانوں میں اس سے بھی زیادہ سختیاں برداشت کرنا پڑی ہیں۔ سیکڑوں عورتوں کو سزا دی گئی تھی اور ان میں سے شاذ و نادر کو اے، یا بی، کلاس

دیا گیا تھا۔ یوں بھی عورت کی زندگی (چاہے سیاسی قیدی ہو یا غیر سیاسی) جیل خانے میں مرد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ سخت ہے۔ مرد تو پھر جو کام ان سے لیا جاتا ہے اسی سلسلے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس حرکت اور تبدیلی سے کسی حد تک ان کے دماغوں میں ایک تازگی سی رہتی ہے۔ عورتوں سے گوکہ اتنا سخت کام نہیں لیا جاتا لیکن انھیں ایک تنگ جگہ میں بند رہنا پڑتا ہے اور ان کی زندگی بالکل یک رنگ ہو جاتی ہے جس میں نہ کوئی حرکت ہے اور نہ کوئی تبدیلی۔ اس کے علاوہ جو عورتیں کہ جیل خانوں میں ہوتی ہیں وہ عام طور پر بحیثیت ساتھی کے مرد قیدیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خراب ہوتی ہیں۔ مردوں میں تو کافی تعداد ایسے قیدیوں کی ہوتی ہے جن کی مجرمانہ ذہنیت نہیں ہوتی اور جو معمولی سیدھے سادے گاؤں والے ہوتے ہیں اور جنھیں کسی وقتی مار پیٹ کے سلسلے میں جس کا تعلق زمینداری کے جھگڑوں سے ہوتا ہے لمبی لمبی سزائیں مل چکی ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں میں مجرمانہ فطرت والیوں کی تعداد بہت زائد ہوتی ہے۔ سیاسی قیدیوں میں جو عورتیں تھیں ان میں کثیر تعداد ہنس مکھ جوان لڑکیوں کی تھی اور ان کو اس ناپاک فضا میں زندگی بسر کرنا پڑی۔ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو کچھ بدسلوکی بھی ہمارے ساتھ جیل خانوں میں یا جیل خانوں کے باہر کی گئی ہے وہ اس سختی کو نہیں پہنچتی جو ہماری عورتوں کے ساتھ کی گئی۔

میں نہیں چاہتا کہ کسی عورت کے ساتھ بھی (چاہے وہ کسان یا مزدور کی بیوی ہو یا کسی ساہوکار کی بیٹی) وہ سلوک کیا جائے جو ہمارے جیل خانوں میں عورتوں کے ساتھ کیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سیاسی قیدیوں میں سے زیادہ تر عورتیں بلکہ قریب قریب سب عورتیں اونچے طبقے یا اوسط طبقے کے خاندانوں کی تھیں۔ کسان ممکن ہے کہ خود سیاسی جذبے کے ماتحت جیل چلا جائے لیکن اس بات کا امکان کم ہے کہ اس کی بیوی بھی اس وجہ سے قیدی بنے۔ حکومت کے نقطۂ نظر سے تو مجموعی طور پر عورت قیدیوں کی حیثیت مرد قیدیوں کے مقابلہ میں زائد ہوئی چاہیے تھی۔ لیکن وکیلوں، تاجروں اور بینک منیجروں کی بیویوں کو 'سی' کلاس دیا گیا تھا۔ وہ خواتین جن کے یہاں مہمان بن کر رہنے کا مجھے شرف حاصل ہو چکا تھا

وہ بھی اسی، کلاس میں رکھی گئیں۔

یو پی لیجسلیٹو کونسل U.P. LEGISLATIVE میں پچھلے سال اس وقت کے ہوم ممبر نے دورانِ تقریر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اگر سیاسی قیدیوں کی آسائش کا زیادہ خیال کیا گیا تو تمام چور، ڈاکو، بدمعاش سیاسی قیدی بن کر جیل خانوں کو بھر دیں گے یہ سن کر اکثر ممبروں کے خوف کی وجہ سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ عورت قیدیوں کی سختیاں کم کرنے کے خلاف بھی انھوں نے کچھ اسی قسم کے عذرات پیش کیے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دلیلیں جن کے سامنے پیش کی گئی تھیں ان میں سے زیادہ تر کی ذہنی قابلیت کے اعتبار سے یہ نامناسب نہیں تھیں اور وقتی طور پر ان سے کام بھی نکالا گیا۔ لیکن ہم میں سے ان لوگوں کے لیے جو ابھی تاریکی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان ممبروں کے برابر روشن دماغ نہیں ہیں۔ اس تقریر نے عجیب و غریب انکشافات کیے اس سے یہ پتہ چلا کہ ہوم ممبر صاحب کس قدر زبردست ماہرِ نفسیات ہیں اور انھوں نے ڈاکوؤں کے طبائع مجرمانہ ذہنیت اور انسانی فطرت کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہوم ممبر صاحب خود نہ سمجھے ہوں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں یا ہم ان کی باتوں کو صحیح مانتے ہوئے بھی کسی دوسرے نتیجے پر پہنچیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ایک ڈاکو اگر جیل خانے میں اسے سختی کا ڈر نہ ہو خوشی خوشی جیل خانے جانے کو تیار ہو جائے گا اور ڈاکہ زنی چھوڑ دے گا تو ظاہر ہے کہ جیل خانے کے باہر بھی اس کو ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں دقت نہ ہو اور تھوڑا بہت بھی سکون اور آسائش اسے نصیب ہو تو وہ اپنے مجرمانہ افعال سے باز رہنے کے لیے بہت جلدی رضامند ہو جائے گا۔ یعنی جو چیز کہ اسے جرم کرنے کی ترغیب دیتی ہے وہ اس کی فاقہ مستی اور مصیبت ہے۔ اگر اس اقتصادی محرک کو ہٹا دیا جائے تو ڈاکہ زنی بند ہو جائے۔ لہٰذا محض سخت سزا دینے سے مجرموں کا انسداد نہیں ہو سکتا جب تک کہ تحریکِ جرم کے بنیادی اسباب دور نہ کیے جائیں۔ لیکن میں پچھلے سال کے ہوم ممبر صاحب پر یہ الزام لگانا نہیں چاہتا کہ ان کے ذہن میں یہ عمیق اور انقلابی خیالات موجود تھے چاہے وہ منطقی طور پر ان کی تقریر کا لازمی نتیجہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی تقریروں میں اس قسم کے جواہر پارے اکثر پائے

جاتے ہیں جس سے ہم کو اس گنج گراں مایہ کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دماغ میں محفوظ ہے اور ان کے ایمان کو جانتے ہوئے ان پر اس کفر کی تہمت نہیں رکھی جا سکتی ۔

سیاسی قیدیوں کا مجموعی طور پر اکثر حوالہ دیا جاتا ہے اور حکومت نے ابھی تک ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کی ہے ۔ موجودہ حالات کا خیال رکھتے ہوئے میرے نزدیک اس میں تو حکومت کی کوئی غلطی نہیں ہے ۔ سیاسی قیدی کون ہیں ؟ تحریک سول نافرمانی کے قیدیوں کو آسانی سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے لیکن کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینے والے کو جو حکومت کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہو گرفتار کرنے کے لیے مختلف قوانین اور احکام کی بہت سی دفعات ہیں ۔ دیہاتوں میں کسان ، نیتاؤں اور کام کرنے والوں کو آئے دن ضابطہ فوجداری کے دفعات میں یا اس سے بھی زیادہ سنگین الزامات لگا کر پکڑ لیا جاتا ہے ۔ یہ گروہ بھی اسی حد تک سیاسی قیدی ہے جس حد تک دوسرا گروہ اور اس کی تعداد بہت کافی ہے ۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ طرزِ عمل اتنا عام نہیں ہے کیونکہ اس کی تشہیر کا خطرہ زائد ہے ۔

اونچی دیواریں اور آہنی پھاٹک قیدخانے کی چھوٹی سی دنیا کو اس بڑی دنیا سے علیحدہ کر دیتے ہیں ۔ اس چار دیواری کے اندر ہر چیز کی صورت بدل جاتی ہے ۔ میعادی قیدیوں کے لیے نہ تو مختلف رنگ ہیں نہ مختلف موسم ، نہ کوئی تبدیلی ہے نہ کوئی حرکت ، نہ کسی امید کی جھلک ہے نہ کسی مسرت کی گنجائش ۔ زندگی صرف ایک بے رنگ یکسانیت کا نام ہے جو ایک ہی طور پر گزرتی چلی جاتی ہے ۔ ایک وسیع ریگستان ہے جس میں کوئی نخلستان نہیں جس کے سائے میں بیٹھ کر کوئی جلتی ہوئی دھوپ سے بچ سکے یا دم لے کر تھکن دور کر سکے ۔ کوئی چشمہ نہیں جس سے پیاس بجھانا تو درکنار اپنے سوکھے ہونٹوں کو تر ہی کر سکے ۔ دن ایک ہی طرح کٹتے کٹتے ہفتے بن جاتے ہیں ہفتے رفتہ رفتہ مہینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ مہینے جڑتے جڑتے سال ہو جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ زندگی کی میعاد پوری ہو جاتی ہے ۔

حکومت کی پوری طاقت اس کے خلاف ہوتی ہے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لیے یا بچنے کے لیے نہ تو اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا ہے اور نہ کوئی سپر ۔ اس کی دردناک

چیخیں بھی ان اونچی دیواروں کے باہر سنائی نہیں دیتیں۔ اس کی فریاد بھی اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں تک آتے آتے رک جاتی ہے۔ کتابی اعتبار سے کچھ رکاوٹیں اس خیال سے ضرور رکھی گئی ہیں کہ اس پر بے جا تشدد نہ کیا جا سکے پبلک کے کچھ افراد یا چند حکام ضرور مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ جیل خانوں کا معائنہ کیا کریں لیکن کسی قیدی میں اتنی ہمت شاذونادر ہی ہوتی ہے کہ وہ کوئی شکایت کرے اور جو ایسا کرتے ہیں ان کو اس ہمت کی سزا بھگتنا پڑتی ہے کیونکہ معائنہ کرنے والا تو چلا جاتا ہے لیکن جیل خانے کا عملہ رہ جاتا ہے اور انھیں سے قیدی کو روزانہ کام پڑتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایسی صورت میں وہ شکایت کرکے اپنی تکالیف میں اضافہ ہونے کا خطرہ گوارہ کرنے کے بجائے اپنی موجودہ مصیبتوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

سیاسی قیدیوں کی کثیر تعداد میں جیل جانے سے قید خانوں کے تاریک گوشوں میں بھی کچھ روشنی پہنچی۔ میعادی قیدی کے تنگ اور تیرہ و تار حجرے میں بھی تازہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ پبلک کو ان کی سختیوں کا کچھ احساس ہوا اور حالات کسی قدر روبہ اصلاح ہوئے لیکن یہ اصلاحات برائے نام ہوئے اور دراصل طرزِ عمل جیسا کہ تھا ویسا ہی قائم رہا۔ کبھی کبھی جیل خانوں میں بھی بلوہ ہو جانے کی خبر سنائی دیتی ہے اس سے حقیقتاً کیا بات ظاہر ہوتی ہے؟ ممکن ہے کہ بےچارے قیدیوں ہی کا قصور ہو۔ تاہم نہتّے، کمزور اور بے یار و مددگار قیدیوں کا جو کہ ایک اونچی چار دیواری میں بند ہیں جیل کے افسروں کی مسلّح طاقتوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہونا ایک مجنونانہ بات ہے۔ اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے اور لازمی طور پر یہی خیال دل میں آتا ہے کہ صرف ناقابلِ برداشت سختی اور انتہائی درجے کی مایوسی ہی قیدیوں کے اس احمقانہ اور از خود رفتہ فعل کی محرّک اور ذمّہ دار ہو سکتی ہے۔

ان وارداتوں کی محکمے کی طرف سے جانچ ہوتی ہے اور شاید کبھی کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تحقیقات کرتے ہیں۔ اس میں غریب قیدی کی سنوائی کی کیا گنجائش ہے؟ ایک طرف تو پوری قابلیت سے تیار کیا ہوا مقدمہ جس کی سارا عملا اور بہت سے ایسے قیدی جن کے لیے ان کا حکم ماننا فرض ہے تائید کرتے ہیں دوسری طرف ہتھکڑی اور بیڑی میں جکڑا ہوا

ایک سہما ہوا اور کانپتا ہوا قیدی جس کو کہ انسانوں نے اچھوت قرار دے دیا ہے جس سے کسی کو ہمدردی نہیں اور جس کی بات کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں۔ یوپی گورنمنٹ کے جوڈیشیل سکریٹری صاحب نے پچھلے نومبر میں مقامی کونسل میں دورانِ تقریر فرمایا تھا کہ جو لوگ کہ جیل خانوں میں بند کئے گئے ہیں وہ جنبہ دار ہیں لہٰذا ان کے بیانات قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جاسکتے۔ بے چارہ قیدی جس کے جسم پر ضربات کے نشانات موجود ہیں وہ خود تو فریق مقدمہ ٹھہرا لہٰذا اس کی شہادت تو ظاہر ہے کہ باور نہیں کی جاسکتی۔ ایسی صورت میں یوپی گورنمنٹ سے یہ امر دریافت طلب ضرور ہے کہ مظلوم قیدی بجز ادپروالی آسمانی طاقتوں کے اور فوق القدرت غائبانہ گواہوں کے کون شہادت پیش کرسکتا ہے؟۔

حکومت کی خفیہ تحقیقاتوں کے اس مزاحیہ پہلو سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا اگر ان کی تہہ میں غم کی ایسی دردناک داستان پوشیدہ نہ ہوتی۔ سر سیمول ہور SIR SAMVEL HOARE کو واجبی طور پر غصہ چڑھتا ہے جب پولیس یا جیل کے عملے کی بدعنوانیوں کی شکایت کی جاتی ہے اور وہ کسی پبلک یا کسی غیر جانب دار تحقیقات کا مطالبہ ہمیشہ رد کر دیتے ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ قریب دو سال ہوئے ہجلی HIJLI کے واقعہ کے متعلق پہلے محکمہ کی طرف سے تحقیقات ہوئی تھی۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد جب حکومت کی طرف سے اس کی جانچ ہوئی تو انھوں نے جیل کے عملے کے قصّے کو بالکل جھوٹا قرار دیا لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے عام طور پر محکمے کی تحقیقاتوں کی کوئی جانچ نہیں کی جاتی اور ان کی مثال کے لیے سر ولیم گلبرٹ SIR WILLIAM GILBERT کے دلچسپ ناٹک ذہن میں آتے ہیں بلکہ وہ غیر فانی اور معرکۃ الآرا تصنیف "تارا بٹیا انوکھی دنیا میں" جس سے کہ ہر بچہ واقف ہے ان سے بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے:

---

لہ آل انڈیا ریڈیو لکھنو نے ALICE WONDERLAND کا یہی ترجمہ کیا ہے اور بہت لوگ اس نام سے واقف ہو چکے ہیں ایسی صورت میں میں نے یہ نامناسب نہ خیال کیا کہ میں بھی یہی نام قبول کرلوں اور انگریزی نام نہ لکھوں۔

یہ بلّی نے چوہے سے اک دن کہا | بہت تو نے مجھ کو پریشاں کیا
ارادہ ہے دعویٰ کروں تجھ پہ آج | نہیں ہے مجھے اور کچھ کام کاج
یہ ڈرتے ہوئے موش بولا حضور | نہیں مجھ سے سرزد ہوا یہ قصور
"کروں میں یہ گستاخیاں کیا مجال" | بدل ڈالیے اپنے دل کا خیال
کوئی اس میں دھوکا ہوا ہے ضرور | میں ثابت کروں گا میں ہوں بے قصور
یہاں فیصلے کی مگر کون راہ | نہ جج ہی کوئی ہے نہ کوئی گواہ
کہا اس سے بلّی نے چپ بدتمیز | کروں گی نہ ضائع میں وقتِ عزیز
کوئی اس میں تاخیر ممکن نہیں | یہ جھگڑا چکے گا ابھی اور یہیں
میں جج ہوں میں جوری میں ہی مدعی | سزا تجھ کو دیتی ہوں میں موت کی

پچھلے سال مجھے خود اس قسم کا ایک ذاتی تجربہ ہوا تھا جس کی کسی قدر عام اہمیت تھی میری ماں اور بیوی میرے بہنوئی سے ملنے الٰہ آباد ڈسٹرکٹ جیل گئی تھیں اور وہاں کے جیلر نے ان سے بدزبانی کی اور ان کو نکال دیا۔ مجھے یہ سن کر بہت غصہ چڑھا تاہم اس امر کی زیادہ اہمیت نہ تھی کیونکہ یہ تو محض ایک گنوار اور ناشائستہ جیلر کی گستاخی تھی مگر مجھے یہ امید تھی کہ اس حرکت پر جیل کا کوئی بڑا افسر اظہارِ افسوس ضرور کرے گا لیکن بجائے اس کے حکومت نے میرے عزیزوں کو بغیر ان سے کچھ پوچھے ہوئے سزا دی۔ ایک طرح یہ سزا مجھ کو بھی ملی کیونکہ کافی عرصہ تک مجھے اپنی ماں اور بیوی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ انسپکٹر جنرل صاحب سے جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بھی اپنے جواب میں میری ماں کے متعلق جو اشارے کیے وہ بدتہذیبی سے خالی نہ تھے۔ یہ سب ہو جانے کے بعد حکومت کو صحیح واقعات مجھ سے اور میری ماں اور بیوی کے بیانات سے معلوم ہوئے۔

یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے فاش غلطی کی تھی کیونکہ میرے متعدد سوالات پر بھی وہ ہمارے بیانات میں کوئی غلطی یا خامی نکال نہ سکے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمارے بیانات کی صحت تسلیم کر لی ہے۔ ایسی صورت میں جو کم سے کم تلافی ان کے لیے ممکن تھی وہ یہی تھی کہ اپنی بے جا حرکت پر نادم ہوتے لیکن میں آج تک ان کے پُرخلوص اظہارِ افسوس

کا انتظار کر رہا ہوں۔

اگر میری ماں اور بیوی سے ایسا برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد حکومت ایسی عجیب ضد سے کام لے سکتی ہے تو ایک معمولی گمنام قیدی اور اس کے عزیزوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہوگا وہ بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ہماری حکومت کا سارا انتظام مثل ایک ڈھانچے کے ہے جو کہ اوپر سے پہنا دیا گیا ہے اور جس کی جڑیں ہماری زندگی تک نہیں پہنچی ہیں اس کا ہر جوڑ کیلوں سے جڑا ہوا ہے اور یہ اسی وقت تک قائم ہے جب تک کہ ایک کیل دوسری کیل کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ یہی اس کی مضبوطی ہے اور (ہماری خوش قسمتی سے) یہی اس کی کمزوری ہے کیونکہ جب ایسا نظام ٹوٹنا شروع ہوتا ہے تو سارا ڈھانچہ یکایک بتاشے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

پچھلے سال قید خانے سے میں نے ہوم ممبر صاحب کو یہ لکھنے کی جرأت کی تھی کہ یوپی کے جیل خانوں کا جو وسیع تجربہ مجھے گزشتہ بارہ سالوں میں ہوا ہے اس کی بناء پر میں نہایت افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے صوبے کے جیل خانے ہر قسم کی زیادتی، بے ایمانی اور آلودگی کے مرکز ہیں۔ کئی سال ہوئے میں نے چند بدعنوانیاں اپنے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو بتائی تھیں (وہ بعد کو انسپکٹر جنرل ہو گئے تھے) انھوں نے یہ بدعنوانیاں تسلیم کیں اور یہ بھی کہا کہ جب پہلے پہل وہ جیل خانے کے محکمے میں آئے تھے تو ان کے دل میں بھی اصلاحی جوش تھا لیکن جب بعد کو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اکیلے ان کی روک تھام کرنے سے قاصر ہیں تو انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جو ہوتا ہے ہونے دیں اور کوئی دخل نہ دیں۔

دراصل بہترین افراد بھی تن تنہا کچھ نہیں کر سکتے اور جن لوگوں کے سپرد یہ کام ہے ان میں سے زیادہ تر لوگ بہترین افراد کی نمایاں مثال کے طور پر پیش نہیں کیے جا سکتے۔ ہندوستانی جیل بھی تو آخرکار اس بڑے بیرونی ہندوستان ہی کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مقصد کیا ہے؟ انسانی بہبودی یا محض ایک کل کو رواں رکھنا یا اہل غرض کے حقوق کی پاسداری؟ سزائیں کس طرح سے دی جاتی ہیں؟ حکومت اور تمدن کی طرف سے محض انتقام لینا یا غلطی کرنے والے کو سدھارنا!

کیا جج صاحبان اور جیل کے حکّام کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ جس بدقسمت کو جیل خانے بھیجا گیا ہے اس کو وہاں سے اس قابل بن کر نکلنا چاہیے کہ وہ معاشرت میں اپنی مناسب جگہ لے سکے ؟ ایسے سوال اٹھانا ہی غالباً گستاخی ہے کیونکہ دراصل کون ان باتوں کی طرف توجہ دیتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے جج صاحبان کے دلوں میں بھی کافی وسعت ہوگی۔ سزائیں تو یقیناً بڑی لمبی لمبی دیتے ہیں۔ پیشاور سے ایسوسی ایٹڈ پریس ASSOCIATED PRESS کی ایک خبر مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۲ء یہ آئی ہے "کولڈ اسٹریم COLD STREAM کے قتل کے چند ہی روز بعد سرحدی صوبے کے انسپکٹر جنرل آف پولیس اور دیگر سربرآوردہ حکّام کے نام دھمکیوں کے خط لکھنے کی بنا پر پیشاور کے سٹی مجسٹریٹ نے مسمی جمناداس ملزم کو حسب دفعات ۵۰۰ و ۵۰۷ تعزیرات ہند آٹھ سال قیدِ سخت کی سزا دی"۔ یہ جمناداس غالباً ایک کم عمر لڑکا تھا۔

دوسری حیرت انگیز مثال لیجیے۔ یہ بھی ایسوسی ایٹڈ پریس کی خبر ہے اور لاہور سے ۲۲ر اپریل ۱۹۳۳ء کو دی گئی ہے۔ "حسبِ دفعہ ۱۹ قانون اسلحہ ایک نوجوان مسلمان مسمی سعادت کو سٹی مجسٹریٹ نے اٹھارہ مہینے کی قید سخت دی۔ اس کے پاس سے ایک چاقو برآمد ہوا تھا جس کا پھل سات انچ لمبا تھا۔"

تیسری مثال مدراس کی لیجیے۔ یہ خبر ۶ر جولائی ۱۹۲۳ء کو موصول ہوئی تھی۔ ایک لڑکے مسمی راما سوامی نے چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے اجلاس پر جبکہ وہ ایک سازش کا مقدمہ سننے میں مصروف تھے ایک معمولی پٹاخہ چھوڑ دیا۔ راما سوامی کو چار سال کی قید سخت دی گئی اور وہ بظاہر نابالغوں کے جیل میں رکھا گیا۔

یہ تین غیر معمولی مثالیں نہیں ہیں ان کی تعداد بہت آنی سے بڑھائی جا سکتی ہے اور ان سے بھی زیادہ دردناک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان والے مصیبت سہنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ایسی عجیب و غریب سزائیں سن کر بھی ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ باوجود اس کے کہ میں نے برداشت کرنے کی

بہت کچھ عادت ڈالی ہے پھر بھی ایسی سزاؤں کو سن کر میرا دم رکنے لگتا ہے ۔ اگر ایسی سزائیں جرمنی کی نازی حکومت کے علاوہ کہیں اور دی جائیں تو یقیناً ایک زبردست شورش کھڑی ہو جائے ۔

اور انصاف ہندوستان میں پورے طور پر اندھا بھی نہیں ہے ۔ اس کی ایک آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی ہے ۔ زمینداری کے ہر جھگڑے یا بلوے میں کافی کسانوں کو کالے پانی کی سزا دی جاتی ہے عام طور پر یہ بلوے اس وقت ہوتے ہیں جبکہ بے چارے کسان زمینداروں کے کارندوں کے پیہم تشدد کی وجہ سے بالکل عاجز آ جاتے ہیں اور ان کی پریشانی ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے ۔ جن لوگوں کی موقع پر موجودگی ہو سکتی تھی ان سب کو نامزد کر دینا یا ان کی شناخت کر لینا ان کو لمبی لمبی سزائیں کرا دینے کے لیے بہت کافی ہے اور ایک نہایت آسان طریقہ ہے ۔ عام طور پر اس طرف کوئی توجہ کبھی نہیں کی جاتی کہ ان کو کیا اشتعال دیا گیا تھا اور شناخت بھی اکثر نہایت کمزور قسم کی ہوتی ہے ۔ کسی ایسے شخص کو پھنسا دینا جس کے خلاف تھانیدار صاحب کی تیوری بدل چکی ہو کوئی مشکل بات نہیں ۔ اور اگر اس معاملے کو کوئی سیاسی رنگ دیا جا سکے ( مثلاً لگان نہ دینے کی تحریک ) تو اس سے زیادہ آسان طریقہ سزایاب کرانے کا نہیں اور ملزم کو سخت سے سخت سزا ملنا یقینی ہے ۔

حال ہی میں ایک کسان کو ایک ٹیکس وصول کرنے والے کو طمانچہ مارنے پر ایک سال کی سزا دی گئی تھی ۔ ایک دوسری مثال لیجیے مگر ذرا مختلف ہے ۔ یہ میرٹھ کا پچھلی جولائی کا واقعہ ہے ۔ ایک نائب تحصیل دار صاحب کسی گاؤں میں آبپاشی کا لگان وصول کرنے کے لیے تشریف لے گئے چپراسی ایک کسان کو تحصیل دار صاحب کے سامنے گھسیٹتے ہوئے لائے اور یہ شکایت کی اس کے بیوی بچوں نے ان کو مارا ہے ( یہ ذرا مشکل سے یقین آنے والی بات ہے ) اس پر نائب صاحب نے یہ حکم دیا کہ بیوی کی خطا پر اس کو سزا دی جائے اور تینوں آدمیوں نے یعنی نائب صاحب خود اور دونوں چپراسیوں نے مل کر اس کی اچھی طرح مرمت کی اور لاٹھیوں سے خوب مارا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارہ کچھ روز بعد مر گیا ۔ نائب صاحب اور دونوں چپراسیوں پر مقدمہ چلایا گیا مگر محض ضرب خفیف پہنچانے کے

مجرم قرار دے گئے لیکن پھر بھی کوئی سزا نہ دی گئی بلکہ چھ مہینے تک نیک چلنی سے بسر کرنے کا وعدہ کرنے پر فوراً چھوڑ دیے گئے۔ نیک چلنی سے غالباً یہی مراد تھی کہ اس چھ مہینے میں کسی اور کو اس طرح نہ ماریں کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ ان دونوں مثالوں کا مقابلہ کرنا کافی سبق آموز ہے۔

لہٰذا جیل خانے کی اصلاح کے سوال اٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ضابطۂ فوجداری کی ترمیم کی جائے اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہمارے ججوں کا دماغ تبدیل کیا جائے جو ابھی تک سو سال پرانی ذہنیت رکھتے ہیں اور جو اس بات سے قطعی طور پر ناواقف اور بے خبر ہیں کہ دنیا اب اس خیال کی ہو چکی ہے کہ سزا محض مجرم کی اصلاح کے لیے دینی چاہئے۔ یہ پھر گھوم پھر کر ہم کو اس مقام پر لے آتا ہے کہ ہماری حکومت کا سارا کا سارا نظام تبدیل ہونے کے قابل ہے۔

لیکن اس مضمون میں ہمیں صرف جیل خانوں ہی سے بحث ہے۔ کوئی بھی اصلاح ہو وہ اسی نیت سے ہونی چاہیے کہ قیدی سدھارا جائے اور وہ ایک نیک باشندہ بن سکے نہ یہ کہ محض اس سے انتقام لیا جائے (میں یہاں سیاسی قیدیوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں کیونکہ حکومت کی نظر میں ان میں سے اکثر تو اس قدر گمراہ ہو چکے ہیں کہ ان کے اصلاح پزیر ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے) اگر ایک دفعہ یہ مقصد تسلیم کر لیا جائے تو آپ سے آپ سارے نظام میں ایک تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالفعل تو جیل خانوں کے حکام میں شاذ و نادر ہی ایسے ہوں گے جن کے ذہن میں بھی یہ بات آتی ہو۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ ہمارے پرانے جیل مینول JAIL MANUAL میں ایک فقرہ اس مضمون کا تھا کہ قیدی سے محنت کرانے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ کوئی مفید یا کارآمد کام کرے بلکہ ایسا کام لیا جائے جس سے اس کو تکلیف پہنچے۔ یہ بتانے کے لیے کہ سزا کا مقصد کیا ہونا چاہیے اس سے بہتر جملہ نہیں مل سکتا ہے۔ جیل کے قوانین کی نئی کتابوں سے یہ جملہ تو نکال دیا گیا ہے لیکن یہ بے درد اور ظالم ذہنیت جو اس جملے سے ظاہر ہوتی ہے اور جس کو انسانیت کی ہوا بھی نہیں لگی ہے وہ ابھی پورے طور پر

موجود ہے۔ اس کتاب میں قیدیوں کے جرائم کی ایک عجیب وغریب لمبی چوڑی فہرست ہے انسانی عقل زندگی کو ناقابلِ برداشت بنانے کے لیے جتنی باتیں بھی سوچ سکتی ہے وہ سب اس میں درج ہے۔ بولنا، گانا، ہنسنا، غیر معینہ اوقات پر ضروریات رفع کرنے کے لیے جانا۔ کھانا نہ کھانا وغیرہ وغیرہ ان سب کا شمار جرائم میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جیل خانے کے عملے کا سارا وقت اسی میں صرف ہو جاتا ہے کہ قیدیوں پر دباؤ ڈالیں اور ان کو ان سیکڑوں قواعد کی خلاف ورزی سے باز رکھیں۔

ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر سزا کافی سخت نہ دی جائے تو جرائم پیشہ گروہ بہت خیرہ سر ہو جائے گا اور اس طرح جرائم کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ دراصل یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ایک صدی پیشتر انگلستان میں معمولی چوری پر پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ جس وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ چوروں کو سزائے موت نہ دی جایا کرے تو ایک بڑی زبردست شورش بھی مچی اور ہاؤس آف لارڈس HOUSE OF LORDS میں یہ بھی کہا گیا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ڈاکوؤں کا راج ہو جائے گا اور کسی کا مال محفوظ نہ رہے گا لیکن اس اصلاح کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور جرائم کم ہو گئے۔ انگلستان اور دیگر ممالک میں جتنا کہ تعزیرات اور جیل کے قوانین کو نرم کرتے گئے اسی قدر جرائم کم ہوتے گئے۔ انگلستان کے بہت سے پرانے قید خانے چونکہ اب خالی ہیں لہٰذا دوسرے کاموں میں لائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں برخلاف اس کے کہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے جیل خانوں کی آبادی (سیاسی قیدیوں کو نکال کے) روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس اضافے میں ہمارے حکام اور ججوں نے لمبی لمبی اور وحشیانہ سزائیں دے کر بہت کچھ مدد دی ہے۔ تمام دنیا اس بات پر متفق ہے کہ نوجوانوں کو اخلاقی طور پر تباہ وبرباد کرنے کے لیے قید خانے سے بدتر کوئی جگہ نہیں اور جہاں تک ممکن ہو انھیں اس سے بچانا چاہیے۔ لیکن ہندوستان کے جیل خانے لڑکوں اور نوجوانوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اکثر ان کو کوڑے بھی مارے جاتے ہیں۔

دوسری غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر جیل خانوں کی حالت بہتر کی گئی تو مجرم ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ وہ لوگ انسانی فطرت سے بالکل ناواقف

ہیں ۔ جیل خانہ چاہے کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو لیکن کوئی شخص خوشی سے قید میں رہنا نہیں چاہتا ۔ اپنا گھر بار چھوڑنا ۔ اپنی زندگی کی معمولی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہونا ۔ اپنے بیوی بچوں اور دوستوں سے جدا ہونا اور اپنی آزادی کھو دینا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ ایک سخت مصیبت ہے ۔ یہ بات تو سب کو بخوبی معلوم ہے کہ ہندوستانی کسان اپنی آبائی زمین پر رہ کر فاقہ کرنا پسند کرتا ہے لیکن کسی دوسرے گاؤں میں جاکر اپنی فاقہ مستی دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ جیل خانوں کی حالت بہتر کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قیدیوں کو آسائش کی زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جائے ۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان معاملات میں انسانیت اور عقل سے کام لیا جائے ۔ قیدیوں سے سخت محنت ضرور لی جائے لیکن یہ وحشیانہ اصولوں کے ماتحت نہ ہو اور بے کار کاموں میں ضائع نہ کی جائے ۔ جیل خانوں میں جو چیزیں بنیں وہ یا تو ایسے کارخانوں میں بننا چاہئیں جہاں قیدیوں کی محنت سے بڑے پیمانے پر اشیاء بن سکیں یا جو گاؤں والوں کی صنعت کا نمونہ ہوں ۔ جو کچھ محنت لی جائے اس سے جیل اور قیدی دونوں کو فائدہ پہنچے اور جیل خانے میں رہنے کا خرچہ کاٹ کر قیدی کو اس کے کام کے بازار کے نرخ پر دام دیے جائیں ۔ دن میں آٹھ گھنٹے کی سخت محنت کے بعد قیدیوں کو اس بات کی ترغیب دینی چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے ملیں اور مختلف مشاغل (مثلاً کھیل، تماشے، ورزش، لکچر، کتب بینی وغیرہ) میں ساتھ ساتھ حصہ لیں۔ سب میں زیادہ اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ہنسیں بولیں اور ایک دوسرے سے نیز جیل کے عملے سے ایسے تعلقات پیدا کریں جس کی بنا انسانیت اور ہمدردی پر ہو ۔ ہر قیدی کو تعلیم کی طرف خاص توجہ دینا چاہیے اور محض الف ب پڑھ لینا یا اپنے دستخط کر لینا کافی نہ سمجھا جائے بلکہ جہاں کہیں بھی ممکن ہو اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی جائے قیدی کے دماغ کو بھی تربیت ملنی چاہیے اور جیل کے کتب خانوں میں اچھی کتابوں کا کافی ذخیرہ ہونا چاہیے جن کو وہ آزادانہ طور پر پڑھ سکے ۔ اور جب چاہے اپنے نام نکلوا سکے ۔ پڑھنے لکھنے کی طرف ہر قیدی کو راغب کرنا چاہیے اور ہر ایک کو کتابیں اور لکھنے کا سامان اپنے پاس رکھنے کی اجازت ہونا چاہیے ۔ قیدی کے لیے اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں ہے

کہ وہ بارہ چودہ گھنٹے تک برابر اپنی تنگ اور اندھیری کوٹھری میں بغیر کسی کام کے بند پڑا رہے اس کے لیے چھٹی ملنا اور ایک آفت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بند رہنے کی میعاد اور بڑھ گئی۔

چند چنے ہوئے اخبار بھی قیدی کے ہاتھ تک پہنچنا لازمی ہیں تاکہ بیرونی دنیا سے اس کا رشتہ قائم رہے اور خطوط لکھنے اور ملاقاتیں کرنے میں جہاں تک ممکن ہو کوئی روک ٹوک نہ کی جائے۔ میرے نزدیک تو ہر ہفتے ان باتوں کی اجازت ملنا چاہیے۔ قیدی کو اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ اس کو بھی انسان سمجھا جا رہا ہے اور جابرانہ اور ذلیل کرنے والی سزائیں دینے سے مطلقاً پرہیز کرنا چاہیے۔

ہندوستان کے جیل خانوں کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے یہ سب خواب کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے صرف ان ہی باتوں کا ذکر کیا ہے جو اکثر ترقی یافتہ ملکوں کے جیل خانوں میں بالفعل رائج ہیں۔ دراصل وہاں اس سے بھی زیادہ قیدیوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر ہمارے موجودہ نظام کو بلکہ خود ہماری حکومت کو نہ تو ان باتوں کا احساس ہے نہ وہ انھیں سمجھ سکتی ہے کیونکہ اس نے اپنے دل و دماغ کو کامیابی کے ساتھ پرانی رسم اور خشک دستور کے تیرہ و تار حجروں میں بند کر دیا ہے۔ تاہم پبلک کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان تغیرات کے لئے اپنی آواز بلند کرے تاکہ جب وقت آئے ان کو عملی طور پر رائج کرنے میں دقت نہ ہو۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے کوئی خاص خرچ بڑھ جائے گا اگر جیل خانے جدید صنعتی اصولوں پر باقاعدہ چلائے جائیں تو ان تمام مجوزہ تبدیلیوں کا خرچ برداشت کرنے کے بعد بھی کچھ منافع ہی بچ رہے گا۔ ان تبدیلیوں کو رائج کرنے میں اگر کوئی مشکل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس کے لیے ایک قابل اور مستعد عملہ ضروری ہے جس میں انسانیت ہو، جو نئے نقطۂ نظر کو بخوبی سمجھتا ہو اور اس سے ہمدردی رکھتا ہو اور جو اسے کامیاب بنانے کے لیے دل سے آرزومند ہو۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کریں اور جہاں کہیں

ممکن ہو دوسرے ملکوں کے جیل خانوں کا معائنہ کریں۔ ان کو فوراً خود معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے جیل خانے ان ملکوں کے جیل خانوں کے مقابلہ میں کتنے پیچھے ہیں۔ ہر جگہ کے برتاؤ میں وہ یہ محسوس کریں گے کہ انسانیت کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے اور یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ جرم معاشرتی اور تمدنی کشاکش کا نتیجہ ہے اور مجرم دراصل ایک مریض ہے جس کو سزا کے مقابلہ میں علاج کی زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی مجرموں کی ذہنیت قریب قریب بچوں کی سی ہوتی ہے اور ان کو صاحب عقل و شعور سمجھنا غلطی ہے۔ سیموئل بٹلر SAMUEL BUTLER کی دلچسپ کتاب اردھان EREWHON میں اس نکتے پر عرصہ ہوا کہ مزاحیہ طور پر زور دیا گیا تھا چھوٹے سے ملک لیٹویا LATVIA کے جیل خانوں میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ "ہر امکانی کوشش کی جاتی ہے کہ گھر کی سی فضا پیدا ہو اور قیدیوں کی کوٹھریوں میں پھول، پودے، کتابیں یا ان کا ذاتی سامان مثلاً تصویریں، وائرلیس سیٹس WIRELESS SETS یا دیگر چھوٹی چھوٹی آرائش کی چیزیں سجا دی جاتی ہیں"۔ قیدیوں کو محنت کی اجرت دی جاتی ہے جس میں سے کہ آدھی ان کو فالتو خرچ (مثلاً اخبار، تمباکو یا کوئی خاص کھانے کی چیز وغیرہ) کے لیے دی جاتی ہے اور آدھی ان کے حساب میں جمع ہو جاتی ہے۔

روس (سوویٹ کی وہ خطرناک سرزمین) غالباً جیل خانوں کی اصلاح میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ حال ہی میں ایک ایسے معتبر شخص نے سوویٹ کے جیل خانوں کا معائنہ کیا تھا جس کی نظر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور جس کی رپورٹ نہایت دلچسپ ہے یہ معائنہ کرنے والے ڈی۔ ان، پرٹ، کے سی D.N. PRITT. K.C. تھے جو انگلستان کے ایک مشہور و معروف بیرسٹر ہیں اور جو ہاورڈ لیگ HOWARD LEAGUE کے صدر بھی ہیں۔ اس انجمن کا خاص مقصد تعزیری اصلاح ہے اور پچھلے ساٹھ سال میں اسی سلسلے میں اس نے انگلستان میں سب سے زیادہ رہنمائی کی ہے اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

پرٹ نے یہ رپورٹ دی ہے کہ روس میں سزا کا تنبیہی پہلو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے اور محض اس کے اصلاحی پہلو پر زور دیا جاتا ہے۔ قیدیوں کے ساتھ حیرت انگیز نرمی اور انسانیت سے سلوک کیا جاتا ہے۔

دو قسم کے قید خانے ہیں۔ (۱) پورے طور پر کھلی ہوئی بستیاں یا نیم کشادہ قیام گاہیں۔ ان کو دراصل جیل خانے نہ کہنا چاہیے کیونکہ یہاں قیدی محض چند پابندیوں کے ساتھ معمولی گاؤں والوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں (۲) بند جیل خانے۔ یہ زندانوں میں سخت ترین سمجھے جاتے ہیں لیکن یہاں بھی قیدیوں کو حیرت انگیز آزادی حاصل ہے نگہبانوں اور قیدیوں میں خوش گوار تعلقات ہیں اور برابر والوں کی طرح ملتے ہیں اور کام کے اوقات چھوڑ کر آپس میں ملنے یا بات چیت کرنے کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے دن میں آٹھ گھنٹے عام کارخانوں کی طرح یہاں بھی کام لیا جاتا ہے اور مناسب اجرت دی جاتی ہے۔ باقی وقت کھیل کود، جسمانی ورزش، لکچر، تعلیم یا ان ناٹکوں کو دیکھنے میں گزرتا ہے جن میں قیدی خود حصہ لیتے ہیں۔ قیدی ایک اخبار بھی نکالتے ہیں جو کہ دیواروں پر چپکا دیا جاتا ہے اور وہ اس میں جیل خانے کے عملہ پر اگر ضرورت ہوتی ہے تو یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ وہ بھول گئے ہیں کہ جیل خانہ مقام تنبیہ نہیں ہے بلکہ جائے اصلاح ہے۔

خود اطاعتی کے اصول جن کو روس کے ہر نظام میں جاری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کسی حد تک جیل خانوں میں بھی رائج ہیں اور قیدی اپنے لیے خود سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ کام کے اوقات چھوڑ کر تمباکو پینے کی پوری اجازت ہے۔ خط و کتابت پر قریب قریب کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور کافی ملاقاتوں کی اجازت ہے اور سب میں زیادہ حیرت انگیز قاعدہ یہ ہے کہ قیدی کو گرمیوں میں پندرہ روز کی چھٹی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے گھر ہو آئے اور اپنی فصل وغیرہ دیکھ آئے۔ عورت قیدی جس کی گود میں بچہ ہو اس کو اختیار ہے کہ چاہے وہ اس بچہ کو جیل خانے کے پرورش خانے میں رکھے یا اسے گھر پر چھوڑ آئے۔ اگر وہ اسے گھر پر چھوڑ آئی ہے تو اسے اپنے

بچے کو دودھ پلانے کے لیے گھر جانے کی دن میں کئی بار اجازت دی جاتی ہے۔

جیل خانوں کی کوٹھریوں میں پھول پودے اور تصویریں بھی موجود تھیں۔ قیدیوں کو برابر دل ودماغ کے ماہرین یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ ان کی ذہنی حالت قابلِ اطمینان ہے معائنہ کرتے رہتے تھے۔ جب کبھی ضروری ہوتا تھا قیدیوں کو علاج کے لیے دماغی اسپتالوں میں رکھا جاتا تھا۔ قیدِ تنہائی شاذونادر ہی دی جاتی تھی۔

یہ باتیں ناقابلِ یقین نہیں تاہم دنیا میں یہ ہو رہی ہیں اور ان کے نتائج حیرت انگیز طور پر اچھے ثابت ہو رہے ہیں۔ روس والے یہ امید کرتے ہیں کہ رفتہ رفتہ جرائم اتنے کم ہو جائیں گے کہ ان کو اپنے بہت سے جیل خانے بند کر دینا پڑیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچھا سلوک بجائے جیل خانے بھرنے کے انھیں خالی کرتا ہے بشرطیکہ اقتصادی پس منظر موافق ہو اور کام ملنے میں دقت نہ ہو۔

کچھ عرصہ ہوا ہاؤس آف کامنز HOUSE OF COMMONS میں ہندوستان کے جانوروں کی حفاظت کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ یہ مقصد قابلِ تعریف ضرور ہے۔ لیکن غالباً یہ یاد رکھنا بھی مناسب نہیں ہے کہ ہندوستان کے دو ٹانگ والے جانوروں کو بھی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ خصوصاً وہ بدنصیب جو جیل خانوں کی لمبی لمبی سزائیں بھگتنے اور سخت سے سخت جسمانی اور دماغی تکالیف سہنے کے بعد ناکارہ ہو کر اور معمولی زندگی میں حصہ لینے کی صلاحیت کھو کر باہر نکلتے ہیں۔

ناروے کے جیل خانوں کی ہر کوٹھری کی دیواروں پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک مشہور ناروجین NORWEGIAN قیدی کی تقریر کا ایک ٹکڑا ہے جس کو نشے کی حالت میں چوری کرنے پر لمبی سزا بھگتنی پڑی تھی اور جو بعد کو ہندوستان بھی آیا تھا اور یہاں اسکینڈینوین سنتال مشن SCANDINAVIAN SANTAL MISSION کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ بعد کو بہت سی زبانیں سیکھ گیا تھا اور نئی اور پرانی ملا کر سترہ زبانیں جانتا تھا جس میں سنتالی زبان بھی تھی۔ وہ ٹکڑا حسبِ ذیل ہے:

"قیدی کے احساسات کو کوئی شخص جب تک کہ وہ خود کسی وقت قید میں نہ رہا ہو نہیں سمجھ سکتا۔ زائد سے زائد اس کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اس رنجیدہ اور مایوس انسان کے جذبات کا جس کو دنیا بھول گئی ہے اور جو اکیلا اپنی تاریک کوٹھری میں بیٹھا ہے نہ تو آئینہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کی خاموش زبان کا ترجمان"
کاش وہ لوگ جن کو قسمت نے ان کوٹھریوں سے باہر رکھا ہے کبھی بھول کر اس بے زبان حسرت نصیب کے بارے میں بھی کچھ سوچ لیا کریں۔

۱۹۳۴ء

---

# زبان کا مسئلہ

(یہ ترجمہ جناب صلاح الدین احمد صاحب کا کیا ہوا ہے اور ۱۹۳۷ء میں "ادبی دنیا" کے ستمبر کے نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ میرے لیے اس مضمون کا اس سے بہتر ترجمہ کرنا ناممکن تھا لہٰذا ان کی اجازت سے اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ میں مترجم موصوف کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ اجازت عطا فرمائی)

گزشتہ چند ماہ سے ہندی اور اردو کا پرانا قضیہ از سر نو تازہ ہو گیا ہے اور دونوں جانب سے نہایت جوش و خروش کے ساتھ الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ جاری ہے۔ افسوس ہے کہ ایسے مسئلے کو جو اپنے حل کے لیے ایک پُرسکون علمی فضا عالمانہ غور و خوض اور علمی بحث کا محتاج تھا۔ بازاری شور و غوغا میں گھسیٹ لایا گیا ہے اور فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور پھر اس اکھاڑے میں جو پہلوان کود رہے ہیں انھیں یقینی طور پر نہ اپنی زبان سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ اس کی ادبیات سے کوئی دلچسپی۔ انھیں تو فقط سرکار کے احکام اور عدالت کے ضابطوں سے مطلب رہا ہے۔ پس وہ لوگ جو زبان سے محض اس لیے الفت کرتے ہیں کہ زبان تہذیب و تمدن کا پیکر، لطیف خیالات کے طائرِ سبک پرواز کا دامِ زنگیں نازک ترین احساسات اور جذبات کا ذریعۂ اظہار۔ شاہدِ معنی کا آئینہ، ادراکِ انسانی کے زیر و بم کا ارگن، الفاظ کی دلچسپ داستانوں اور دل کش بندشوں کا شیرازہ اور زندگی اور

اس کی بوقلموں کیفیتوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ لوگ جنھیں زبان ان خصوصیات اور ایسی دیگر صفات کے باعث عزیز ہے وہ ہمیشہ ان بازاری جھگڑوں کو حیرانی کی نگاہوں سے دیکھا کیے اور اپنا دامن بچا کر علیحدہ کھڑے رہے۔

بایں ہمہ ہم اس مسئلے کی طرف سے تغافل نہیں برت سکتے اور اس سے دور بھی نہیں رہ سکتے کیونکہ زبان کا مسئلہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت محض بعض لوگوں کی جاہلانہ چیخ و پکار پر مبنی نہیں کہ ہندوستان زبان کے معاملے میں بابل کا روایتی مینار ہے جس کے بسنے والے سیکڑوں بولیاں بولتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہر صاحبِ بصیرت پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں رقبے کے لحاظ سے بہت کم زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہ سب آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ علاوہ بریں ہندوستان میں ایک عالمگیر اور مقبول عام زبان بھی رائج ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد دس بیس کروڑ سے کم نہیں۔ پھر بھی زبان کا مسئلہ پیچیدہ ہے اور ناخنِ گرہ کشا کا محتاج ہے۔

اس وقت ہمیں اس مسئلہ کی طرف اس کی متعلقہ سیاسی اور فرقہ وارانہ پیچیدگیوں کے باعث بھی متوجہ ہونا پڑے گا لیکن یہ ایک عارضی گزر جانے والی کیفیت ہے اصل مسئلہ اس صورت میں باقی رہے گا کہ ہم تعلیم جمہور اور عوام کی تمدنی ترقی کے عام پروگرام میں زبان کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کریں اور اپنی گوناگوں اور بیش قیمت روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک قومی اتحاد کی بنیادیں کس طرح استوار کریں۔

زبان کا مسئلہ کسی قوم کے لیے ہمیشہ بہت بڑے نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ اب سے پورے تین سو سال پہلے مشہور انگریزی شاعر ملٹن نے ایک خط میں جو اس نے فلورنس سے اپنے ایک دوست کو لکھا اس اہمیت کی وضاحت یوں کی ہے " یہ امر کچھ کم نتیجہ خیز نہیں ہے کہ ایک قوم کی زبان کیسی ہے۔ خالص یا خراب۔ یا وہ لوگ اسے عام طور پر کس حد تک صحت و صفائی سے بولتے ہیں جس ملک کی زبان کے الفاظ بجائے خود کریہہ اور ناخوش گوار ہوں گے یا مسلسل غلط استعمال کے باعث ان کی شکل وصورت مسخ ہو گئی ہوگی۔ وہ نہایت واضح طور پر اس بات کا اعلان کریں گے کہ اس ملک کے رہنے والے نہایت کاہل اور بے حس

لوگ ہیں جن کے دماغ ہر قسم کی غلامی قبول کرنے کے لیے مدت سے تیار ہو چکے ہیں ۔
اس کے برخلاف ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ کوئی ریاست یا سلطنت جب تک کہ اس نے اپنی زبان کو اپنی محبت اور حفاظت کے سائے میں رکھا کم از کم ایک اوسط درجے کی ثروت و طاقت کی مالک نہ رہی ہو ۔

(۲)

ایک زندہ زبان گویا ایک جیتا جاگتا جسم ہے جس کی رگوں میں زندگی کا خون ہر وقت رواں رہتا ہے اور یہ بمصداق ع

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

ہر لحظہ بڑھتا پھیلتا اور ان لوگوں کے خیالات و جذبات کی پیہم ترجمانی کرتا رہتا ہے جو اسے بولتے اور لکھتے ہیں یا اسے ایک عمارت سمجھیے کہ جس کے وسیع زریں ایوانوں میں عوام آباد ہیں اور جس کا تنگ سہ منزلہ خواص کے تمدن کا حامل ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم منازلِ بالا سے احکام صادر کر کے یا ریزولیوشن پاس کر کے اس کی شکل و صورت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر دیں ۔ لیکن میں اکثر اس عام خیال سے دوچار ہوا ہوں کہ اگر ہم چاہیں تو ایک زندہ زبان کو اپنی مرضی کے مطابق ایک خاص مسلک اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ دنیا کے جدید حالات میں پریس، سینما، ریڈیو اور اشاعت کتب کی وساطت سے جمہور میں ایک عام پروپیگنڈا اور عام تعلیم کے وسیع الاثر ذرائع کو حرکت میں لا کر زبان میں گزشتہ زمانے کی بہ نسبت بہت جلد تبدیلیاں پیدا کی جا سکتی ہیں لیکن زبان کی یہ تبدیلیاں بھی ان بڑی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہوں گی جو خود عوام کی ذہنیتوں میں رونما ہو رہی ہیں جب کبھی کوئی زبان عوام سے اپنا رشتہ توڑتی ہے تو وہ ایک بے جان اور مصنوعی چیز ہو جاتی ہے حالانکہ اسے ایک زندہ طاقتور اور فرحاں و شاداں ہستی ہونا چاہیئے بس ایسی تمام کوششیں جو کسی زبان کو ایک خاص جانب ترقی دینے کے لیے کی جائیں گی ۔ ہمیشہ اس کی صورت بگاڑنے اور اس کی روح کو کچلنے میں صرف ہوں گی

(۳)

زبان کے متعلق حکومت کی کیا پالیسی ہونی چاہیے۔ کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" کے ریزولیوشن میں اسے مختصر طور پر لیکن نہایت صفائی اور وضاحت سے یوں بیان کیا ہے " اقلیتوں اور مختلف لسانی رقبوں کے تمدن، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی " کانگریس اس اعلان کی پابند ہے اور کسی اقلیت یا لسانی مجموعے کو اس سے زیادہ اطمینان کی ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں کانگریس نے اپنے دستور میں اور بہت سی قراردادوں میں بار بار اعلان کیا ہے کہ اگرچہ ملک کی مشترکہ زبان ہندوستانی قرار دی جائے لیکن صوبجاتی زبانوں کو اپنے اپنے حلقوں میں فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔

کوئی زبان تجویزوں کے ذریعے سے ملک میں رائج نہیں کی جاسکتی۔ پس کانگریس کی یہ کوششیں کہ ایک طرف ملک میں ایک مقبولِ عام مشترکہ زبان پیدا کی جائے اور دوسری جانب صوبجات میں مقامی زبانوں کو اظہارِ مطالب کا ذریعہ بنایا جائے اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتیں اور عوام پر مطلق اثر انداز نہیں ہوسکتیں جب تک کہ وہ موجودہ حالات اور ضروریات کے مطابق نہ ہوں۔ پس ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اس شرط کو کس حد تک پورا کرتی ہیں۔

(۴)

ہمارے بڑے بڑے صوبوں کی زبانیں محض بولیاں نہیں ہیں انھیں بعض دفعہ محض جہالت سے ایسا سمجھا جاتا ہے وہ قدیم زبانیں ہیں جنھیں تہذیب و تمدن کا معقول ورثہ ملا ہے ان میں سے ہر زبان کو کروڑوں آدمی بولتے ہیں اور ہر زبان اپنے حلقے میں عوام اور خواص دونوں کے جذبات و خیالات زندگی اور تمدن کے ساتھ نہایت مضبوطی سے وابستہ ہے۔ یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ عوام کی تعلیمی اور تمدنی ترقی ان کی اپنی ہی زبان کے ذریعے سے ممکن ہوسکتی ہے۔

پس یہ ناگزیر ہے کہ ہم صوبجاتی زبانوں کی اہمیت پر زور دیں اور اپنا زیادہ تر کام انھیں سے نکالیں۔ کسی اور زبان کا استعمال ہر جگہ وہاں کے مختصر تعلیم یافتہ طبقے کو لازماً عوام سے جدا کرنے اور ان کی ذہنی ترقی کو روک دینے کا باعث ہوگا۔ جب سے کانگریس

نے اپنے کام کے لیے صوبجاتی زبانوں کی وساطت اختیار کی ہے ہم نے عوام سے اپنے تعلقات بہت جلد مضبوط کر لیے ہیں اور ملک بھر میں کانگریس کی طاقت اور وقار میں بہت اضافہ ہوگیا ہے ۔ کانگریس کا پیغام ہر دورافتادہ جھونپڑی تک پہنچ گیا ہے اور عوام کا سیاسی شعور روز بروز بڑھ رہا ہے ۔ پس یہ لازم ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام اور پبلک کاروبار کی بنیاد صوبجاتی زبانوں پر رکھی جائے ۔

یہ زبانیں کون کون سی ہیں ۔ اول ہندوستانی اپنی دونوں صورتوں یعنی اردو اور ہندی اور اپنی مختلف بولیوں کے ساتھ ۔ پھر بنگالی مرہٹی اور گجراتی جو ہندی کی بہنیں ہیں اور اس سے ملتی جلتی ہیں جنوب میں تامل، تلگو، کناری اور ملیالم ۔ ان کے علاوہ اڑیا، آسامی اور سندھی ہیں اور شمال مغرب میں پنجابی اور پشتو ۔ یہ بارہ تیرہ زبانیں سارے ہندوستان پر حاوی ہیں ان میں سے ہندوستانی سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے اور ایک لحاظ سے ملک بھر کے لیے مشترک زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے ۔

(۵)

صوبجاتی زبانوں کے مختلف دائروں میں مداخلت کیے بغیر ہمیں ہندوستان بھر کے لیے اظہار خیالات کے ایک مشترک ذریعہ کی بھی ضرورت ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام انگریزی سے لیا جاسکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اونچے طبقے کی ضروریات اور ہندوستان کی مشترکہ سیاسی اغراض کا تعلق ہے ۔ انگریزی سے ایک حد تک کام لیا جا چکا ہے ۔ لیکن اگر ہم جمہور کا خیال کریں تو یہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہو جائے گا ۔ ہم کروڑوں انسانوں کو ایک بالکل پردیسی زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے ۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے گزشتہ تعلقات اور اپنی موجودہ عالمگیر اہمیت کے باعث انگریزی لازمی طور پر ہمارے لیے ایک بہت اہم زبان رہے گی ۔ بیرونی دنیا سے رابطہ رکھنے میں ہمارے لیے یہ سب سے زیادہ اہم زبان ہوگی ۔ اگرچہ مجھے امید ہے کہ اس مطلب کے لیے بھی محض یہی زبان استعمال نہیں کی جائے گی ۔ میری رائے میں ہمیں دوسری غیر ملکی زبانیں مثلاً فرانسیسی، جرمنی، روسی، اسپینی، اطالوی، چینی اور جاپانی بھی سیکھنا چاہئیں ۔ بہرحال

یہ طے شدہ ہے کہ انگریزی جمہور کے لیے ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں بن سکتی۔ یہ امتیاز ہندوستانی اور فقط ہندوستانی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جسے آج بارہ کروڑ انسان بولتے ہیں اور ان کے علاوہ کروڑوں پوری طرح نہیں تو ایک بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں اور وہ لوگ جو ہندوستانی نہیں جانتے۔ کسی غیر ملکی زبان کے مقابلے میں اسے نہایت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بہت سے مشترک الفاظ ہیں لیکن اس امر سے بہت زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان زبانوں کا تمدّنی پس منظر، بولنے والوں کے جذبات و خیالات اور لسانی میلانات ایک ہیں۔ ان وجوہ سے ایک ہندوستانی کے لئے ایک دوسری ہندوستانی زبان سیکھنا نسبتاً بہت آسان ہے۔

(۶)

ہندوستانی کیا ہے؟ ہم مبہم طور پر کہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندی اور اردو دونوں پر حاوی ہے اور ہم دونوں میں سے ایک جیساکہ یہ بولی اور علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہیں۔ درمیانی زبان نکالتے ہیں اور اس اپنی دریافت کردہ اوسط کا نام ہندوستانی رکھ دیتے ہیں۔ کیا یہ اوسط محض ایک خیال بے بنیاد ہے یا اس کے واقعی کچھ معنی بھی ہیں؟

ہندوستانی کی جیساکہ وہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے مختلف حصوں میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ بہت سی مختلف صورتیں ہیں جن سے کئی چھوٹی چھوٹی بولیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر یہ تعلیم کی کمی کے لازمی نتائج ہیں اور جمہور میں تعلیم کے عام ہونے سے یہ غائب ہو جائیں گی اور صحتِ زبان کا ایک معیار قائم ہو جائے گا۔

رہا رسم الخط۔ تو دیوناگری اور اردو طرزِ تحریر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے ایک رسم الخط دوسرے کو جذب کرلے گا اس لیے ہم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہیں اور پھولیں پھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس صورت میں ان لوگوں پر جو دونوں زبانیں سیکھنا چاہیں گے ایک زائد بار پڑے گا اور ایک حد تک جداگانہ ذہنیت کی حوصلہ افزائی بھی ہو گی۔ لیکن ہمیں یہ قباحتیں برداشت ہی کرنی پڑیں گی کیونکہ اس کے سوا کوئی

کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ دونوں رسم الخط ہماری زبان کی مخصوص طبیعت کے حصے ہیں اور ان کے گرد نہ صرف ان سے مخصوص ادبیات جمع ہوگئی ہیں، بلکہ جذبات کی ایسی زبردست فصیلیں کھنچ گئی ہیں جن کی شکست و ریخت ناممکن ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مستقبل بعید ہمارے لیے کیا کچھ لائے گا لیکن اس وقت تو دونوں کو جیوں کا تیوں رکھنا ہی پڑے گا۔

زبان کے متعلق ہماری بعض مشکلات کے حل کے لیے لاطینی رسم الخط کی وکالت بھی کی گئی ہے۔ تیز کام انجام دینے کے لحاظ سے یہ رسم الخط اپنے اندر بلاشبہ اردو یا ہندی دونوں سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے ٹائپ رائٹر۔ ڈپلیکیٹر DUPLICATOR اور اس قسم کی دوسری مشینوں کے موجودہ دور میں لاطینی طرزِ تحریر کو ہندوستان کے رسوم الخط پر واقعی بہت فوقیت حاصل ہے کیونکہ موخر الذکر ان ایجادات سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان فوائد کے باوجود لاطینی رسم الخط کے لیے اردو یا دیوناگری کی جگہ لینے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ جذبات کا حصار تو ہے ہی اور اسے مزید تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ لاطینی رسم الخط ہمارے غیر ملکی فرماں رواؤں سے میل کھاتا ہے۔ لیکن اس کے مسترد کرنے کی اور مستحکم وجوہات بھی ہیں۔ ہمارے رسوم الخط ہماری ادبیات کے لازمی حصے ہیں ان کے بغیر ہم اپنی قدیم روایات سے بالکل جدا ہو جائیں گے۔

یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم اپنے رسوم الخط کی ایک حد تک اصلاح کر لیں۔ ہندی اور اردو کے علاوہ اس وقت بنگالی، مرہٹی، گجراتی ایسے رسوم الخط ہیں جو دیوناگری سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ یہ بہت آسانی سے ممکن ہے کہ ان چار زبانوں کے لیے ایک رسم الخط مقرر کر دیا جائے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ موجودہ دیوناگری رسم الخط ہی ہو۔ اس میں قدرے تبدیلی کی جا سکتی ہے مذکورۂ بالا چار زبانوں کے لیے ایک رسم الخط کا قرار پا جانا ان سب کے لیے مفید ثابت ہوگا اور انھیں ایک دوسرے سے قریب تر لے آئے گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ جنوب کی دراوڑی زبانوں کے طرزہائے تحریر کی کسی شمالی رسم الخط سے مطابقت کہاں تک ممکن ہے یا وہ آپس میں کس حد تک مربوط ہو سکتے ہیں؟ جن اصحاب نے اس سوال پر غور کیا ہے وہ اس بارے میں ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔

اردو رسم الخط کو موجودہ صورت پر ہی قائم رکھنا ہوگا۔ ہاں اسے کسی حد تک آسان تر بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے بہت آسان ہے کہ سندھی رسم الخط کو جو اس سے بہت ملتا ہے اپنے میں جذب کرلے۔

پس آگے چل کر ہمارے لیے دو رسوم الخط رہ جائیں گے۔ ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کا مربوط رسم الخط اور اردو طرزِ تحریر اور اگر ضرورت ہو تو ایک جنوبی رسم الخط۔ ان میں سے کسی ایک کو دبانے یا مٹانے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔ سوائے ایسی صورت میں کہ اہلِ جنوب و شمال باہمی رضامندی سے جنوبی زبانوں کے رسم الخط کو ایک شمالی طرزِ تحریر کے مطابق کرلیں۔ اور یہ طرزِ تحریر ہندی کی خفیف سی تبدیل شدہ صورت ہی ہوسکتی ہے۔

(۷)

اب ہمیں ہندوستانی بہ حیثیت شمالی اور وسطی ہند کی مادری زبان کے اور بحیثیت ہندوستان کی مشترکہ زبان کے علیحدہ علیحدہ غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

ہندی اور اردو اس زبان کی دو بڑی صورتیں ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ دونوں کی بنیاد گرامر اور معمولی الفاظ کا ذخیرہ ایک ہی ہے اور دونوں درحقیقت ایک ہی بنیادی زبان ہیں تاہم ان کے موجودہ اختلافات کچھ کم نہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک اپنا دجدان سنسکرت سے حاصل کرتی ہے اور دوسری کسی حد تک فارسی سے۔ ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا حماقت ہے۔ اردو اپنے طرزِ تحریر کے سوا سراسر خاکِ ہند کی پیداوار ہے اور ہندوستان کے باہر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور آج بھی شمالی ہند میں ہندوؤں کے بے شمار گھرانوں میں اردو ہی بولی جاتی ہے۔

ہندوستان کے مسلم فرماں روا اپنے ساتھ فارسی لائے اور یہی ان کے درباروں کی سرکاری زبان قرار پائی اور اس کی یہ حیثیت مغل بادشاہوں کی حکومت کے آخر تک قائم رہی۔ اس اثنا میں شمالی اور وسطی ہند کے جمہور کی زبان ہندی ہی رہی اور چونکہ یہ ایک زندہ زبان تھی اس نے فارسی کے بہت سے الفاظ اپنے میں جذب کرلیے۔ علیٰ ہٰذا

گجراتی اور مرہٹی نے بھی کیے۔ لیکن اصلیت کے لحاظ سے ہندی ہندی ہی رہی مغل دربار کے قرب و جوار میں ہندی کی ایک مبالغہ آمیز فارسی صورت رواج پاگئی جسے ریختہ کہتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اردو مغل شہنشاہوں کے عہد میں مغل چھاؤنیوں میں رائج ہوا۔ لیکن یہ ہندی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس سے ہندی کی ایک ذرا مختلف صورت بھی مراد لی جاتی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک اردو کے معنی رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی ہی سمجھے جاتے تھے اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے ہندی کے بعض بہترین شاعر مسلمان ہوئے ہیں۔ اس ہنگامہ تک بلکہ اس سے کچھ بعد تک زبان کا نام ہندی ہی رائج تھا اس میں رسم الخط کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا بلکہ محض ملکِ ہند کی زبان مراد تھی مسلمان لکھنے والے بھی جو اردو رسم الخط میں لکھتے تھے اس زبان کو ہندی ہی کہتے تھے۔

یہ انیسویں صدی کے وسط کے آخر کا ذکر ہے کہ ہندی اور اردو کے دو مختلف معنی لیے جانے لگے اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔

غالباً پہلے پہل ہندوؤں نے قومیت کے روز افزوں احساس سے متاثر ہو کر خالص ہندی اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال پر زور دینا شروع کیا۔ ان کے لیے قوم پرستی شروع شروع میں لازمی طور پر ہندو قوم پرستی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں میں بھی آہستہ آہستہ قومیت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے اور انھوں نے مسلم قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی اور اس کی فضا میں اردو مسلمانوں کی مخصوص ملکیت تصوّر کی جانے لگی۔ اب رسم الخط کی بحث چھڑ گئی اور سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اس کے استعمال پر کھینچا تانی شروع ہو گئی پس زبان کے روز افزوں تفریق اور رسوم الخط کی باہم آویزش سیاسی اور قومی شعور کی اس بیداری کے نتائج تھے جس نے پہلے پہل فرقہ پرستی کی صورت اختیار کی لیکن جیوں جیوں یہ فرقہ وارانہ قوم پرستی سچی قوم پرستی میں تبدیل ہوتی گئی اور لوگوں نے مسائل کو فرقہ واری کے زاویۂ نگاہ کے بجائے خالص ملکی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا تیوں تیوں زبان میں علیحدگی کے رجحانات کو روکنے کی خواہش پیدا ہوتی گئی اور سمجھ دار لوگ اردو ہندی کی مشترک خوبیوں اور خصوصیتوں کو نمایاں کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے ہندوستانی

کو نہ صرف شمالی اور وسطی ہند کی قومی زبان سمجھا جانے لگا بلکہ اسے ہندوستان کی واحد مشترک زبان قرار دیے جانے کے تذکرے بھی شروع ہوگئے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں ابھی فرقہ وارانہ ذہنیت کافی اثر رکھتی ہے اس لیے ملک میں اتحادِ لسانی کی خواہش کے ساتھ ساتھ علیحدگی کا رجحان بھی موجود ہے یہ بات یقینی ہے کہ یہ جداگانہ ذہنیت شعور قومیت کی پوری بیداری کے بعد غائب ہوجائے گی اور ہم پر نہایت وضاحت سے یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اس خرابی کی اصل وجہ کیا ہے اب بھی اگر آپ زبان کی علیحدگی کے کسی پرجوش حامی کا بیرونی رنگ وروغن اڑا کر دیکھیں تو وہ حقیقت میں فرقہ پرست بلکہ اکثر اوقات سیاسی طور پر رجعت پسند نکلے گا۔

(۸)

اگرچہ مغل دور میں ایک طویل عرصے تک اردو ہندی کے الفاظ ایک معنی میں استعمال ہوتے رہے لیکن اردو سے زیادہ تر وہ مخلوط زبان مراد لی جاتی ہے جو مغل چھاؤنیوں میں رائج تھی۔ شاہی دربار اور عسکری فرودگاہوں کے ارد گرد بہت سے فارسی الفاظ رائج تھے اور یہ اس زبان میں داخل ہوتے گئے۔ ہم جس قدر مغل درباری زندگی کے مرکزوں سے دور ہوتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھتے ہیں اردو کو خالص ہندی میں سمویا ہوا پاتے ہیں یہ ناگزیر تھا کہ دربار کا لسانی اثر دیہات کی بہ نسبت شہروں پر اور پھر جنوبی شہروں کی بہ نسبت شمالی شہروں پر بہت زیادہ ہوا۔

اور یہ نکتہ ہمیں اردو ہندی کے موجودہ حقیقی فرق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اردو شہروں کی زبان اور ہندی دیہات کی زبان ہے ہندی شہروں میں بھی بولی جاتی ہے لیکن اردو قریب قریب صرف ایک شہری زبان ہے۔ پس اردو اور ہندی کو آپس میں قریب تر لانے کا مسئلہ درحقیقت گاؤں اور شہر کے باہمی اتصال کا اہم ترین مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرنا نہ صرف فضول ہوگا بلکہ ناپائیدار ثابت ہوگا۔ زبانیں اپنی ہیئت اسی وقت بدلتی ہیں جب ان کو بولنے والے بھی بدل جاتے ہیں۔

(۹)

اگرچہ گھروں میں بولی جانے والی اردو ہندی میں باہم چنداں فرق نہیں لیکن گزشتہ چند سال سے علمی و ادبی اردو ہندی کی درمیانی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے۔ ادبی تصنیفات میں یہ فرق بہت نمایاں ہے اور اس سے بعض لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ اس فرق کے پس پشت بدنیت لوگوں کے اغراض کام کر رہے ہیں۔ یہ خیال کم فہمی پر مبنی ہے اگرچہ اس میں شک نہیں بعض افراد جدائی کے رجحان کو زیادہ کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن زندہ زبانیں اس طرح توڑی مروڑی نہیں جا سکتیں اور چند افراد ان پر اس قسم کے قدرت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس ظاہری فرق کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے ہمیں زیادہ گہری نظر ڈالنا پڑے گی۔

یہ تفاوت اگرچہ بجائے خود قابلِ افسوس ہے لیکن حقیقت میں صحت مندانہ نشو و نما کی علامت ہے۔ اردو ہندی دونوں زبانیں سکون و جمود کے ایک لمبے وقفے کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور آگے بڑھنے میں مصروف ہیں۔ وہ نئے نئے خیالات کو جامۂ اظہار پہنانے اور پرانی روشوں کو چھوڑ کر ادبیات میں جدید طرزِ بیان اور ادائے مطالب اختیار کرنے کے لیے جد و جہد کر رہی ہیں۔

جہاں تک جدید تصورات کا تعلق ہے دونوں زبانوں کا ذاتی سرمایہ الفاظ کم ہے لیکن دونوں کی دسترس میں سنسکرت اور فارسی کے دو بیش بہا معدن ہیں اس لیے جیوں ہی کہ ہم گھر اور بازار کی عام زبان سے آگے بڑھ کر زیادہ لطیف حلقوں میں داخل ہوتے ہیں دونوں زبانوں کا باہمی فرق نمایاں تر ہونے لگتا ہے۔ ادبی انجمنیں جنھیں اپنی اپنی زبانوں کی پاکیزگی کا بہت خیال رہتا ہے اس رجحان کو انتہا تک لے جاتی ہیں اور پھر ایک دوسرے پر جداگانہ میلانات کی حوصلہ افزائی کا الزام لگایا کرتی ہیں۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتیں اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا انھیں بہت آسانی سے نظر آجاتا ہے۔

مذکورہ بالا اسباب کا فوری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی اور اردو کی درمیانی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی ہے اور بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا جدا جدا

زبانیں بن جانا مقدر ہو چکا ہے تاہم یہ خوف بے بنیاد ہے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہمیں
اس نئی زندگی کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو اردو اور ہندی دونوں کے پیکر میں سرایت کر رہی ہے
خواہ اس سے ان کا باہمی اختلاف عارضی طور پر زیادہ ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ ہندی اور
اردو دونوں اس وقت جدید علمی، سیاسی، معاشرتی، تجارتی اور بعض اوقات تمدنی تصورات
کے موزوں اظہار کی پوری اہلیت نہیں رکھتیں۔ دونوں زبانیں اپنا سرمایہ بڑھانے کی
کامیاب جدوجہد میں مصروف ہیں تاکہ وہ دورِ جدید کے سماج کی لسانی ضروریات پوری
کرسکیں۔ پھر ایک دوسرے سے حسد کیوں کیا جائے۔ ہم اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ
الفاظ کا سرمایہ دار دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اگر ہم ہندی یا اردو
الفاظ کو اس وجہ سے مٹانے کوشش کرتے رہے کہ وہ ہمارے اپنے مخصوص پس منظر میں ٹھیک
نہیں بیٹھتے۔ ہمیں دونوں کی ضرورت ہے اور ہمیں دونوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ہمیں اس
بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہندی کا فروغ اردو کی ترقی سے مراد ہے اور اردو کی نشوونما
ہندی کے پھلنے پھولنے سے عبارت ہے دونوں ایک دوسرے پر نہایت شدت سے اثر انداز
ہوتی رہیں گی اور دونوں زبانوں کے الفاظ اور تصورات کے ذخیرے بڑھتے رہیں گے مگر لازم
ہے کہ دونوں اپنے دروازے اور کھڑکیاں ان الفاظ اور تصورات کی آمد کے لیے پوری طرح
کھلی رکھیں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہندی اور اردو دونوں غیر زبانوں کے الفاظ اور تصورات
کو خوش آمدید کہیں اور انھیں اپنا لیں۔ انگریزی یا فرانسیسی یا کسی اور غیر زبان کے ایسے الفاظ
کے لیے جو آسان اور مقبولِ عام ہوں نئے سنسکرت اور فارسی الفاظ گڑھنا ایک
احمقانہ بات ہے۔ میرے دل میں اس بات کے متعلق کوئی شک نہیں کہ اردو اور ہندی کا ایک
دوسرے سے قریب تر آنا ناگزیر ہے اور اگرچہ ان دونوں کے ظاہری لباس مختلف ہوں
لیکن حقیقت میں وہ ایک زبان ہو کر رہیں گی۔ اس اتحاد کو ترقی دینے والی قوتیں
انفرادی کوششوں کے روکے سے نہیں رک سکتیں۔ قوم پرستی کے جذبات اور ایک متحدہ
ہندوستانی قومیت کے قیام کی عالمگیر خواہش آخر میں فتح یاب ہو کر رہے گی اور اس
سے بڑھ کر یہ کہ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے۔ ہمارے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں انقلاب

برپا ہے آمدورفت اور نشرو اشاعت کے ذرائع بہت تیز اور وسیع ہو چکے ہیں اور ان کی مدد سے باہمی تبادلۂ خیالات اور میل جول میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں ۔ یہ سب اسباب مل کر زبان کے اتحاد پر یقیناً خوش گوار اثر ڈالیں گے جب زمانے کا سیلِ رواں جوش و خروش سے گزر رہا ہو تو ہم تنگناؤں میں کیوں کر چھپے رہیں گے ۔ تعلیم جب عام ہو کر جمہور کو اپنے حلقے میں لائے گی تو اس میں یک جہتی اور ایک معیار کا قائم ہونا لازمی ہو جائے گا ۔

(۱۰)

پس ہمیں اردو اور ہندی کے جداگانہ فروغ کو بھی شک و شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے ۔ اردو کے حامیوں کو اس نئی روح کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو ہندی میں سرایت کر رہی ہے اور ہندی کے عاشقوں کو بھی ان کوششوں کی داد دینی چاہیے جو اردو کے بہی خواہ اس کی ترقی کے لیے سرانجام دے رہے ہیں ۔ دونوں فریق آج ایک دوسرے سے علیحدہ متوازی طریقوں پر کام کیے جائیں اگرچہ کل ان کا ملنا ضروری ہے اور گو ہمیں اسی موجودہ جداگانہ روش کو رضامندی سے برداشت کر لینا چاہیے پھر بھی ہمیں دونوں کے اتحاد کے لیے اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے ۔ اس اتحاد کی بنیاد کس چیز پر رکھی جائے گی ؟ یقیناً جمہور پر کیونکہ جمہور ہی کو اردو ہندی کا مشترک عنصر قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ہماری بہت سی موجودہ مشکلات کا سبب وہ حد درجہ کی مصنوعی ادبی زبان ہے جس کا جمہور سے کوئی تعلق نہیں ۔ کبھی آپ نے سوچا کہ جب مصنفین لکھتے ہیں تو وہ کن کے لیے لکھتے ہیں ۔ ہر مصنف کے ذہن میں شعوری یا نیم شعوری طور پر ایک ایسا حلقہ سامعین ہوتا ہے جس پر وہ اپنے خیالات کا پرتو ڈالتا اور جسے اپنے نقطۂ نظر کا حامی بنانا چاہتا ہے ۔ افسوس کہ ہماری عام جہالت کی وجہ سے یہ حلقہ ہمیشہ نہایت محدود رہا ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے مصنفین کے لیے کافی بڑا ہے اور روز بروز وسیع ہو رہا ہے ۔

میں اس معاملے میں ایک ماہر کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن میرا خیال ہے کہ ایک اوسط درجے کا ہندی یا اردو مصنف اس موجودہ حلقۂ سماعت سے بھی پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا وہ ان مخصوص ادبی مجالس کا زیادہ خیال رکھتا ہے

جن سے اس کا روز مرّہ کا تعلق ہوتا ہے اور وہ گویا ان ہی کے لیے ان کی پسندیدہ زبان میں لکھتا ہے اس کی آواز اور اس کے الفاظ جمہور کے وسیع تر طبقے تک نہیں پہنچتے اور اگر پہنچتے بھی ہیں تو سمجھے نہیں جاتے پھر اگر اردو اور ہندی کی کتابیں بہت کم فروخت ہوتی ہیں تو حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔ ہمارے اردو اور ہندی اخبارات بھی عوام کے وسیع حلقے میں نہیں پہنچتے کیونکہ وہ عام طور پر بلند طبقے کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

پس ہمارے مصنفین کو اپنے ذہن میں ایک جمہوری حلقۂ تخاطب قائم کر کے ارادتاً عوام کے لیے لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان خود بخود سہل ہو جائے گی اور مصنوعی و آرائشی بندشیں جو ہمیشہ کسی زبان کے زوال کا باعث ہوتی ہیں پر زور اور زندگی سے بھرپور الفاظ کے لیے جگہ خالی کر دیں گی۔

ہم ابھی تک اس خیال سے چھٹکارہ نہیں پا سکے کہ تہذیب اور ادبی قابلیتیں درباری حلقوں سے وابستہ اور ان ہی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ہمارا یہ طرز تخیل ہمیں محدود دائروں میں قید رکھتا ہے اور ہمیں عوام کے دل و دماغ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں دکھاتا۔ موجودہ دور میں تہذیب و تمدن کی عمارت کو ایک وسیع تر جمہوری بنیاد پر تعمیر کرنا ہوگا اور زبان کو بھی جو کہ تہذیب و تمدن کا ایک پیکر ہے ان ہی بنیادوں پر قائم ہونا پڑے گا۔

جمہور تک رسائی حاصل کرنے کا سوال محض سادہ الفاظ اور بندشوں کا مسئلہ نہیں ہے اسے ان الفاظ و فکرات کے اندرونی معانی اور تصورات سے بھی برابر کا تعلق ہے۔

ایک جمہور پسند زبان کے لیے ضروری ہے کہ اسے عوام کے مسائل زندگی سے تعلق ہو اور وہ ان کے رنج و راحت اور امید و بیم کا ذریعہ اظہار ہو۔ اسے بحیثیت مجموعی عوام کی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے نہ کہ خواص کے خیالات کی نمائندہ ہی ایک صورت

ہے جس میں کوئی زبان ایک مستقل زندگی حاصل کرنے کی امید کرسکتی ہے۔

یہ نظریہ محض اردو یا ہندی نہیں بلکہ ہماری سب ہندوستانی زبانوں پر عاید ہوتا ہے مجھے علم ہے کہ ان سب میں ایسے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے اور وہ روز بروز عوام کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ ہمیں اس عمل کو تیز تر کرنا چاہیے اور ہمارے مصنفین کو ارادتاً اس کی حوصلا فزائی کرنا چاہیے۔

میری رائے میں ہماری زبانوں کو غیر ملکی زبانوں کے قدیم علوم اور جدید ادب سے تراجم کے ذریعے سے شناسائی پیدا کرنی چاہیے۔ ایسا کرنے سے ہم دوسرے ممالک کی تمدنی ادبی اور معاشرتی تحریکوں سے قریب تر ہو جائیں گے اور تازہ تصورات کی درآمد سے ہماری زبانوں کو تقویت پہنچے گی۔

میرا خیال ہے کہ سب ہندوستانی زبانوں میں بنگالی عوام سے تعلق پیدا کرنے کے لحاظ سے پیش پیش ہے ادبی بنگالی بنگال کی جمہوری زندگی سے کوئی علیحدہ یا دور افتادہ چیز نہیں ہے ایک فرد واحد رابندرناتھ ٹیگور کی وہبی قابلیت نے اس خلیج کو پاٹ دیا ہے جو انے گنے متمدن خواص اور عوام کے درمیان حائل تھی اور اس کے پیارے گیت اور دل کش نظمیں بنگال کی چھوٹی سی چھوٹی جھونپڑیوں میں بھی سنی جاتی ہیں ان سے نہ صرف بنگالی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے بلکہ خود جمہور بنگال کی زندگیاں شاداب ہو رہی ہیں اور بنگالی زبان نازک ترین ادبی مطالب کو سادہ ترین الفاظ میں ادا کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رابندرناتھ جیسے غیر معمولی دل و دماغ والے روز پیدا نہیں ہوتے لیکن ہمیں ان کی مثال کی پیروی سے اپنے لیے صحیح راہِ عمل تجویز کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں مجھے گجراتی کا ذکر بھی کرنا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ گاندھی جی کی سادہ اور پر زور زبان نے گجراتی لٹریچر پر بہت نمایاں اثر کیا ہے۔

(۱۱)

اب ہمیں ہندوستانی پر اس کی دوسری حیثیت یعنی ہندوستان کی مشترکہ

زبان کے طور پر غور کرنا چاہیے اور اس امر کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ اسے بڑی بڑی صوبجاتی زبانوں سے نہ کوئی رقابت ہے اور نہ ان کے مخصوص علاقوں میں مداخلت کی ضرورت۔ اس وقت ہمیں رسم الخط کا سوال ایک طرف رکھ دینا پڑے گا کیونکہ دونوں رسوم کا پھلنا پھولنا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں رسوم کی تعلیم لازمی قرار نہیں دے سکتے کیونکہ یہ امر عوام پر ایک ناقابلِ برداشت بار ثابت ہوگا حکومت کو دونوں رسوم کی سرپرستی کرنی چاہیے اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب طلباء یا ان کے والدین پر چھوڑ دینا چاہیے پس ہمیں اب رسم الخط کو چھوڑ کر زبان کی اصلیت پر غور کرنا ہے۔

ہندوستانی ہندوستان کی ملک گیر زبان ہونے کے علاوہ چند ایسی خصوصیات بھی رکھتی ہے جو اسے ایک مشترکہ زبان ہونے کی اہلیت عطا کرتی ہیں اسے اور زبانوں کی بہ نسبت آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے قواعد سہل ہیں تذکیر و تانیث کی الجھنیں ضرور ہیں لیکن سوال ہے کہ کیا ہم ہندوستانی کو اور بھی سادہ بنا سکتے ہیں۔

ہماری رہنمائی کے لیے ایک بہت کامیاب تجربہ پہلے سے موجود ہے۔ یہ بنیادی انگریزی کی تشکیل ہے بہت سے عالموں نے کئی برس کی محنت سے انگریزی کی ایک سادہ صورت تجویز کی ہے جو اگرچہ خالص انگریزی ہے لیکن سیکھنے میں بالکل سہل ہے۔ چند نہایت سادہ قواعد کے سوا گرامر تقریباً غائب ہے اور علمی اصطلاحی اور تجارتی تراکیب کو چھوڑ کر بنیادی لغات کو صرف نوسو اسّی (۹۸۰) الفاظ تک محدود کر دیا گیا ہے یہ تمام لغات اور گرامر اور الفاظ ایک صفحہ کاغذ میں سما سکتے ہیں اور ایک معمولی ذہانت رکھنے والا شخص اسے دو یا تین ہفتوں میں ازبر کر سکتا ہے ہاں اس نئی زبان کے استعمال میں مشق کی لازماً ضرورت ہوگی۔

اس تجربے کو ان کوششوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جو قبل ازیں دنیا کے لیے ایک عام زبان مثلاً اسپرانٹو دولاپک وغیرہ تجویز کرنے کے لیے کی گئیں۔ ایسی تمام زبانیں سادہ ہونے کے باوجود بے حد مصنوعی تھیں اس لیے ان کا سیکھنا ایک زائد بار سے کم نہ تھا۔ ان کے جسم میں زندگی کی روح پرور رسائی نہیں تھی اور وہ کبھی انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی زبان نہیں بن سکتی تھیں۔ اس کے خلاف بنیادی انگریزی ان کی تمام خوبیاں رکھنے

کے باوجود مذکورہ بالا نقص سے بری ہے کیونکہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ بنیادی انگریزی سیکھنے سے دوسروں سے گفت وشنید کا نہ صرف ایک سادہ اور نہایت عمدہ ذریعہ حاصل ہوجاتا ہے بلکہ سیکھنے والا معیاری انگریزی کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے اور اگر چاہے تو آسانی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔

بنیادی انگریزی کی نسبت میری پرُجوش دلچسپی سے غالباً یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ پھر بنیادی انگریزی ہی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان کیوں نہ قرار دیا جائے؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس زبان کی طبیعت قطعی طور پر ہمارے اہلِ ملک کے لیے بالکل اجنبی ہے، اور اسے ان پر عاید کرنے کے لیے ہمیں انھیں ان کے موجودہ ماحول سے جدا کرکے انگریزی فضا میں لانا پڑے گا۔ اس زبان کو رائج کرنے میں جو عملی مشکلات در پیش آئیں گی۔ وہ ہندوستانی کی ترویج کے مقابلے میں جو پہلے سے ملک پر چھارہی ہے بے حد زیادہ ہوں گی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ جہاں ہم انگریزی کو ایک غیر ملکی زبان کے طور پر سکھاتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ انگریزی کی تعلیم ایک وسیع پیمانے پر جاری رکھنی پڑے گی) وہاں بنیادی انگریزی سکھائی جائے اور صرف وہ لوگ معیاری انگریزی سیکھیں جو اس زبان کا بطورِ خاص مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔

(۱۲)

کیا بنیادی انگریزی کی طرح ہم ایک بنیادی ہندوستانی تیار کرسکتے ہیں؟ میرے خیال میں اگر ہمارے عالم اس طرف توجہ دیں تو یہ بات آسانی سے ہوسکتی ہے۔ گرائمر جس قدر سادہ ہوسکے کردی جائے لیکن اسے موجودہ قواعد کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دی جائے۔

اس ضمن میں سب سے ضروری بات یہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ یہ بنیادی زبان اگرچہ تمام غیر اصطلاحی خیالات وتصورات کے اظہار کے لیے بجائے خود ایک مکمل چیز ہو لیکن زبان کے وسیع تر مطالعے کے لیے صرف ایک شمعِ ہدایت کا کام دے۔ لغات کم وبیش ایک ہزار

ایسے الفاظ پر مشتمل ہو سکتی ہے جو بے ترتیبی سے نہ چنے جائیں اور ان کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ نہ رکھا جائے کہ وہ ہندوستانی زبانوں کے مشترک الفاظ ہیں۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ ایسا ہر لفظ مکمل ہو اور کسی خارجی مدد کے بغیر عام بول چال میں اپنا مطلب بخوبی واضح کر سکے۔

ایسی بنیادی ہندوستانی ملک کی مشترکہ زبان قرار دی جائے حکومت کی تھوڑی سی امداد سے یہ نہایت سرعت سے تمام ملک میں پھیل جائے گی اور اس قومی اتحاد کے قیام میں مدد دے گی جو ہم سب کو اس قدر عزیز ہے۔ یہ نہ صرف اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب تر لے آئے گی۔ بلکہ زبانوں کا ایک آل انڈیا اتحاد قائم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ ایسی مضبوط اور مشترکہ بنیاد پر اگر زبان کی مختلف صورتیں بھی قائم ہوئیں تو وہ جدائی کی طرف نہیں لے جائیں گی۔ وہ لوگ جو ہندوستانی کا وسیع تر مطالعہ کرنا چاہیں گے آسانی سے اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے اور جو لوگ بنیادی ہندوستان پر قائم رہنا چاہیں گے وہ بھی قوم کی وسیع تر زندگی میں حصہ لے سکیں گے۔

میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہمیں اردو اور ہندی کے جداگانہ فروغ پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں اطراف سے جو نئے الفاظ آئیں گے وہ اگر زندہ الفاظ ہوں گے اور حالات کے اثر یا عوام میں مقبولیت کے باعث ہم تک پہنچیں گے تو وہ یقیناً ہمارے ترکے میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔ لیکن ایسے مصنوعی الفاظ زیادہ تر اپنی روز افزوں سیاسی، معاشرتی، علمی اور تجارتی ضروریات کی تکمیل کے لیے بنانے پڑے ہیں ان الفاظ کی صنعت میں ہمیں تو اترا اور جداگانہ ذہنیت اختیار کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے ہمیں جرأت سے کام لے کر ایسے غیر ملکی اصطلاحی الفاظ جو دنیا کی زبانوں میں مشترک ہو چکے ہیں۔ بلا تکلف ہندوستانی میں داخل کر لینے چاہئیں نہ صرف ہندوستانی میں بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی۔ اس طرح ہمارے اہلِ وطن کو ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں میں

ایک ہی قسم کے اصطلاحی الفاظ سے دوچار ہونا پڑے گا اور اس کا فائدہ ظاہر ہے۔ اس کے خلاف کرنے سے ان طالب علموں کے لیے جنھیں مختلف زبانوں میں مختلف اصطلاحات سے سابقہ پڑتا ہے بہت سی الجھنیں پڑ جائیں گی۔ ایک علیحدہ سائنٹفک اور علمی مجموعہ الفاظ مرتب کرنے سے ہماری علمی نشو و نما دوسرے علمی حلقوں سے علیحدہ ہو کر کمزور ہو جائے گی اور اساتذہ اور طلبار پر بے حد بار پڑ جائے گا۔ دنیا کی جمہوری زندگی اور پبلک معاملات آپس میں بے حد مربوط ہیں اور مل کر ایک واحد سالمہ بناتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اہل وطن انھیں سمجھ سکیں اور ان میں حصہ لے سکیں اور غیر ملکی لوگ بھی ہمارے پبلک معاملات میں ایسی ہی دلچسپی لے سکیں۔

اس طرح بہت سے غیر ملکی الفاظ ہندوستانی زبان میں لیے جا سکتے ہیں اور لیے جانے چاہئیں مگر ہمیں اپنی زبان میں بھی ایسے اصطلاحی الفاظ کی کافی تعداد دستیاب ہو جائے گی۔ مناسب ہوگا اگر ماہرین زبان عام استعمال کے لیے ایسے الفاظ کی ایک جامع فہرست مرتب کر دیں۔ ایسا کرنے سے نہ صرف ان معاملات میں جہاں اختلاف اور ابہام نہایت مذموم ہوتا ہے یکسانیت اور صحت پیدا ہو جائے گی بلکہ بے معنی الفاظ اور بندشوں کا استعمال بند ہو جائے گا۔ ہمارے اخبار نویس دوستوں کی یہ عادت ہے کہ وہ غیر ملکی الفاظ اور تراکیب کا نہایت بے تکلفانہ ترجمہ کر ڈالتے ہیں جو ان کے اصل مطلب سے چنداں تعلق نہیں رکھتا اور پھر یہ ڈھیلے ڈھالے الفاظ نشر و اشاعت کی کرامات سے رائج الوقت سکہ بن کر خیالات کی بے شمار الجھنیں پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ٹریڈ یونین TRADE UNION کا ترجمہ بعض دفعہ بیوپار سنگ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل درست لفظی ترجمہ ہے لیکن اسے ٹریڈ یونین کے معنوں سے دور کی نسبت بھی نہیں اس سے بہت زیادہ دلچسپ ترجمہ امپریل پریفرنس IMPERIAL PREFERENCE کا ہے جسے ایک من چلے اخبار نویس نے "شاہی پسند" کے دلکش الفاظ میں پیش کیا ہے۔

(۱۴)

اب یہ دیکھنا ہے کہ زبان کے متعلق حکومت کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ حکومت کے لیے عدالتوں، دفاتر اور تعلیم کے معاملے میں اس مسئلے کا فیصلہ کرنا لازمی ہے۔

ہر صوبے میں حکومت کے امور وہاں کی مقامی زبان میں سرانجام پانے چاہئیں لیکن ہر صوبوں میں ہندوستانی کی آل انڈیا حیثیت کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ ہندوستانی بولنے والے صوبوں میں دونوں رسوم کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا لازمی ہے اور ہر شخص کو اس امر کا اختیار رہنا چاہیے کہ وہ کسی عدالت یا دفتر سے تخاطب میں ہندی رسم الخط برتے یا اردو۔ اور ایسی حالت میں اس پر دوسرے رسم الخط میں نقل مہیا کرنے کا بار نہیں ڈالنا چاہیے کسی ایک رقبے میں جو رسم الخط رائج ہو وہاں کی عدالت یا دفتر کی بیشتر کارروائی اس میں انجام پائے گی اور اس بات پر اصرار بیجا ہوگا کہ ہر عبارت دونوں رسوم میں لکھی جائے۔ مگر سرکاری اعلانات کا دونوں رسوم میں شائع کیا جانا ضروری ہے۔ سرکاری تعلیم کے لیے کلیتاً قاعدہ یہ ہو کہ یہ طالب علم کی زبان میں دی جائے۔ پس ہر لسانی رقبہ کے لیے وہاں کی مقامی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائے لیکن میں ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ جہاں کہیں ایک خاص لسانی گروہ سے متعلق افراد کی خاصی تعداد موجود ہو اور ان کی زبان اپنے حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو انھیں حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا مطالبہ کریں ایک حد تک ایسے مطالبے کی تکمیل کا انحصار اس بات پر بھی ہوگا کہ ایک خاص مرکز میں اردگرد کے طلبار آسانی سے جمع ہو سکتے ہوں۔ یہ سہولت پرائمری تعلیم کے لیے ضروری ہوگی اور اگر طلبار کی تعداد کافی ہو تو ثانوی تعلیم کے لیے بھی جائز ٹھہرائی جائے۔

مثلاً کلکتے میں ذریعہ تعلیم بنگالی ہوگا۔ لیکن وہاں ایسے افراد کے بہت بڑے بڑے گروہ موجود ہیں جن کی مادری زبانیں ہندوستانی، تامل، تلگو اور گجراتی ہیں ان میں سے ہر گروہ حکومت سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ ان کے بچوں کی پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ یہ عمل ثانوی تعلیم میں کہاں تک جاری رکھا جا سکتا ہے

اس کی بابت میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا انحصار طلبار کی تعداد اور دیگر متعلقہ امور پر ہوگا اس میں شک نہیں کہ ثانوی تعلیم کے ابتدائی درجوں میں اور ان کے بعد ان طلبار کو اپنے لسانی حلقے کی زبان ضرور سیکھنی پڑے گی۔

ہندوستانی بولنے والے صوبوں کے مدارس میں اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط سکھائے جائیں گے اور طلبا یا ان کے والدین کو ان میں سے ایک کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔ پرائمری کے درجوں میں صرف ایک رسم الخط سکھایا جائے اور ثانوی مدارج میں دوسرا رسم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں کے مدارس میں ثانوی درجوں میں بنیادی ہندوستانی سکھائی جانی چاہیے اور رسم الخط کے انتخاب کا سوال اشخاص متعلقہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

یونیورسٹی کی تعلیم بھی لسانی حلقوں کی زبان میں دی جائے اور ہندوستانی (کسی ایک رسم الخط کے ساتھ) اور ایک غیر ملکی زبان لازمی قرار دی جانی چاہیے۔

لیکن یہ التزام صنعتی مدارس اور اعلیٰ صنعتی تعلیم پر عائد نہیں ہونا چاہیے۔

ثانوی مدارس میں غیر ملکی اور ہماری قدیم قومی زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن سوائے خاص نصابات لینے اور یونیورسٹی میں داخل ہونے کی صورت کے ان کی تعلیم لازمی قرار نہیں دی جانی چاہیے۔

صوبجاتی زبانوں میں میں نے پنجابی اور پشتو کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرائمری تعلیم انہی زبانوں میں دی جانی چاہیے۔ لیکن چونکہ یہ کافی طور پر ترقی یافتہ نہیں ہیں غالباً اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں ثابت نہیں ہوں گی۔ ان علاقوں میں غالباً اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستانی ہی بہترین زبان ثابت ہوگی۔

(۱۴)

میں نے اپنی بہت سی باتیں صحیح فرض کر کے جو مختلف تجاویز پیش کی ہیں ان کا تعلق پرائمری تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیم تک سے ہے ان پر نکتہ چینی کرنا اور ان مشکلات کا واضح کرنا جو ان کی تکمیل میں حائل ہو سکتی ہیں۔ شاید چنداں مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ میں

نہ ماہرِ تعلیم ہوں اور نہ ماہرِ زبان ۔ مگر میرا ماہر نہ ہونا ہی شاید میرے لیے مفید ہے کیونکہ میں اس مسئلہ کو ایک عام شخص کے غیر جانبدارانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکتا ہوں میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں تعلیم کے اہم اور مشکل مسئلے پر بحث نہیں کر رہا ہوں ۔ میں صرف اس کے لسانی پہلو کا جائزہ لے رہا ہوں جب ہم تعلیم کے مکمل موضوع پر غور کریں گے تو ہمیں بہت سی باتیں مدنظر رکھنی پڑیں گی مثلاً ہمیں اس سوسائٹی اور حکومت کی کیفیت کو ملحوظ رکھنا ہوگا جس میں یہ تعلیم جاری ہوگی ۔ ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارے شہری کیسے ہوں اور ان کے مشاغل کس قسم کے ہوں ہمیں ان کی زندگی اور کاروبار کی رعایت سے ان کی تعلیم کا معیار قائم کرنا ہوگا ہمیں ان کی خانگی، سماجی اور پبلک زندگی میں ایک ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنی ہوگی ۔ اگر ہمیں دنیا کی دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے تو ہمیں صنعتی اور سائنٹفک تربیت پر بہت زیادہ زور دینا ہوگا ۔ ہمیں یہ سب کچھ اور اس سے بہت کچھ زیادہ کرنا پڑے گا اور ایسا کرنے میں موجودہ بے کار ۔ فرسودہ اور سرگراں نظامِ تعلیم کو مٹا کر اس کی جگہ زیادہ مضبوط بنیادوں پر ایک نیا نظامِ تعلیم تعمیر کرنا ہوگا ۔

لیکن اس وقت ہمیں اپنی توجہ صرف زبان کے سوال تک محدود رکھ کر کسی متفقہ نتیجہ پر پہونچنا چاہیے ۔ میں نے یہ مضمون اس غرض سے لکھا ہے کہ اس پر ایک وسیع تر زاویہ خیال سے اہلِ بصیرت کو دعوت فکر دوں ۔ اگر ہم ان عام اصولوں پر متفق ہو جائیں جن پر میں نے بحث کی ہے تو عملی اعتبار سے ان کا نفاذ چنداں مشکل ثابت نہ ہوگا ۔ موجودہ نام نہاد صوبجاتی خودمختاری کے باوجود ہم ان میں سے بہت سے اصولوں کو نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ ہمارے مالی ذرائع ناکافی ہیں اور کئی دیگر مشکلات ہمارے راستے میں حائل ہیں لیکن جس حد تک ممکن ہو ہمیں ان پر عمل پیرائی کی کوشش کرنی چاہیے ۔

ممکن ہے کہ میری بعض تجاویز پر ایک عام اتفاق کی صورت نکل آئے اور بعض

سے اتفاق نہ کیا جا سکے۔ لیکن ہمیں کم ازکم یہ جان لینا چاہیے کہ ہم آپس میں کہاں تک متفق ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد زیرِ بحث مسائل محدود ہو جائیں گے اور ان پر جدا جدا غور کیا جا سکے گا۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں لسانی رقبے اور صوبجات کی حدود آپس میں منطبق ہونی چاہئیں۔

(۱۵)

مذکورہ بالا غور و خوض کو آسان تر بنانے کے لیے میں اپنی بعض موٹی موٹی تجاویز درج ذیل کرتا ہوں۔

(۱) ہمارے پبلک کام اور سرکاری تعلیم کے لیے ہر لسانی رقبے کی مخصوص زبان استعمال ہونی چاہیے۔ اس مطلب کے لیے ہندوستان میں مندرجہ ذیل زبانوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے:
ہندوستانی (اردو اور ہندی دونوں) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، کناری، ملیالم، اُڑیا، آسامی، سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی۔

(۲) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں اردو اور ہندی دونوں اپنے جدا جدا رسم الخط کے ساتھ سرکاری طور پر تسلیم کی جانی چاہئیں۔ پبلک اعلانات دونوں رسوم میں جاری ہونے لازمی ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہو کہ عدالتوں اور دفاتر کے ساتھ معاملات کرنے میں دونوں میں سے ایک رسم الخط چن لے اور اسے یہ مجبوری نہیں ہونی چاہیے کہ دوسرے رسم الخط میں اپنی تحریر کی نقل داخل کر دے۔

(۳) ہندوستانی رقبے میں ہندوستانی ذریعہ تعلیم ہوگی اور تعلیم دونوں رسم الخط میں دی جائے گی اور دونوں کو تسلیم کیا جائے گا طلبار یا ان کے والدین دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھیں گے طلبار پر دونوں رسوم الخط سیکھنے لازم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ ثانوی مدارس میں دوسرا رسم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۴) ہندوستانی (مع اپنے دونوں رسوم الخط کے) سرکاری طور پر آل انڈیا زبان تسلیم کی جائے گی اور اس لحاظ سے ہر شخص کو مجاز ہوگا کہ وہ ہندوستان کے کسی دفتر یا عدالت کے ساتھ ہندوستانی میں معاملہ کرے اور تحریر میں دونوں میں سے کوئی ایک رسم الخط اختیار کرے اور اس پر لازم نہیں ہوگا کہ اپنی تحریر کی نقل دوسرے رسم الخط میں مہیا کرے۔

(۵) دیوناگری، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی رسوم الخط کو متحد کرنے اور ایک ایسا مخلوط رسم الخط مقرر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو چھاپے، ٹائپ رائٹر اور دیگر جدید ایجادوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔

(۶) سندھی رسم الخط کو اردو میں جذب کر دینا چاہیے اور اردو رسم الخط کو امکانی حد تک سہل کرکے چھاپے اور ٹائپ رائٹر کے لیے موزوں بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۷) جنوبی رسوم الخط کو دیوناگری کے قریب ترلانے کی ممکنات کا پتہ چلانا چاہیے اور اگر یہ ممکنات بہم نہ پہنچ سکیں تو مختلف جنوبی زبانوں یعنی تامل، تلگو، کناری اور ملیالم کے لیے ایک مخلوط رسم الخط کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔

(۸) لاطینی رسم الخط میں ہمیں خواہ کیسی ہی خوبیاں نظر آئیں کم از کم موجودہ دور میں اسے رائج کرنے کے امکانات پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ پس ہمارے لیے صرف دو رسوم الخط رہ جائیں گے ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی کا مخلوط رسم الخط اور اردو سندھی کا رسم الخط اگر ضرورت ہو تو جنوبی زبانوں کا ایک مخلوط رسم الخط اس صورت میں کہ وہ اول الذکر رسم الخط سے مطابقت نہ کر سکیں۔

(۹) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں ہندی اور اردو کا جداگانہ رجحان اگر ترقی کی طرف مائل ہو تو خطرے کا باعث نہیں اور ان دونوں کے نشوونما میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ یہ جداگانہ فروغ زیادہ دقیق تصورات کے زبان میں داخل ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہندی اور اردو کی علیحدہ علیحدہ ترقی بھی

ہندوستانی کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ آگے چل کر جب عالمگیر تحریکوں اور قومیت کے جذبے کا دباؤ ان پر پڑے گا تو ہر چیز اپنی جگہ پر بیٹھ جائے گی اور پھر جمہور کی عام تعلیم سے ایک معیار اور یکسانیت قائم ہو جائے گی۔

(۱۰) ہمیں زبان کے (اس میں اردو ہندی کی تخصیص نہیں سب زبانیں مراد ہیں) مقبولِ عام طرزِ بیان پر زیادہ توجہ دینی چاہیے مصنفین کو عوام کی تعلیم کے لیے عوام کی سادہ زبان میں لکھنا چاہیے۔ اور ان مضامین پر لکھنا چاہیے جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ درباری اور مصنوعی طرزِ تحریر کی حوصلہ شکنی کرنا اور سادہ اور پُر زور طرزِ تحریر کو فروغ دینا چاہیے۔ اس روش سے جہاں اور بہت سے فائدے ہوں گے وہاں اردو اور ہندی میں یکسانیت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(۱۱) بنیادی انگریزی طرز پر ہندوستانی زبان میں سے ایک بنیادی ہندوستانی پیدا کرنی چاہیے۔ یہ ایک سادہ زبان ہوگی جس کی گرامر نہ ہونے سے برابر اور لغات ایک ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہوگی اسے معمولی بول چال اور لکھنے پڑھنے کے لیے ایک مکمل زبان بنانا ہوگا۔ اس کا گوشت پوست خالص ہندوستانی ہوگا اور یہ زبان وسیع تر مطالعے کے لئے پہلے زینے کا کام دے گی۔

(۱۲) بنیادی ہندوستانی کے علاوہ ہمیں متعدد اصطلاحی، علمی، سائنٹفک سیاسی اور تجارتی الفاظ مقرر کرنے ہوں گے جو اردو ہندی اور اگر ممکن ہو تو ہندوستانی کی دیگر زبانوں میں بھی یکساں استعمال ہو سکیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہو ایسے الفاظ غیر ملکی زبانوں سے مستعار لے کر اپنی زبان میں جذب کر لیے جائیں اور دیگر مناسب اور موزوں الفاظ اپنی زبان سے چن کر فہرستیں بنائی جائیں تاکہ تمام اصطلاحی اور سائنٹفک معمولات میں ہم ایک نہایت صحیح اور یکساں ذخیرۂ الفاظ استعمال کر سکیں۔

(۱۳) حکومت کی تعلیمی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ تعلیم طالب علم کی زبان میں دی جائے ہر لسانی رقبے میں پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم کے لیے اس رقبے کی زبان

مستعمل ہو۔ اگر کسی زبان کے رقبے میں ایسے طلبار کی ایک کافی تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو ان کا حق ہوگا کہ پرائمری تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں بشرطیکہ وہ ایک مرکزی مقام پر جمع ہو سکیں۔ اگر ان کی تعداد کافی ہو تو یہ بھی ہو سکے کہ انھیں ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ مگر ایسے تمام طلبار کے لیے اپنے حلقے کی قدرتی زبان بطور ایک لازمی نصاب کے لینی پڑے گی۔

(۱۴) ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں میں بنیادی ہندوستانی ثانوی مدارس میں سکھائی جائے اور رسم الخط کا سوال طلبار پر چھوڑ دیا جائے۔

(۱۵) یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے ذریعۂ تعلیم رقبے کی زبان ہوگی اور ہندوستانی اپنے کسی رسم الخط کے ساتھ اور ایک غیر ملکی زبان لازمی موضوعِ درس ہوں گے۔ یہ لازمی شرط اعلیٰ صنعتی نصابات کی صورت میں نافذ نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ حلقے کے طالب علموں کے لیے بھی زبانوں کا سیکھنا مناسب ہوگا۔

(۱۶) ثانوی مدارس میں ہماری قدیم قومی زبانیں اور غیر ملکی زبانیں سکھانے کا انتظام کیا جائے گا لیکن خاص نصابات یا یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لیے تیاری کی صورت کے علاوہ ان کی تعلیم لازمی نہیں ہوگی۔

(۱۷) ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کی قدیم کتابوں کے تراجم بڑے پیمانے پر کیے جانے چاہئیں تاکہ ہماری زبانیں ان ممالک کی تمدنی، ادبی اور سوشل تحریکوں سے لگاؤ پیدا کریں اور اس اتصال سے اپنے لیے طاقت و قوت حاصل کریں۔

# ٹرین میں

میرے دوست اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کس وقت پڑھتا ہوں۔ میری زندگی مختلف قسم کے کاموں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جس میں سے شاید کچھ مفید اور کارآمد ہیں اور کچھ کی افادیت مشکوک ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ سیاسیات کا خوفناک کاروبار ہماری جوانی کو گھن کی طرح کھا رہا ہے اور وہ دن رات اس کی نذر ہوتے جا رہے ہوں جنھیں ہم اور زیادہ مسرت خیز مشغلوں میں صرف کر سکتے ہیں۔ کتابوں سے دل لگانا اور ان کی مسحور کر لینے والی دنیا میں پھرنا آسان کام نہیں ہے۔ تاہم ان خشک مشاغل میں بھی میں رات کو کچھ وقت ایک ایسی کتاب پڑھنے کے لیے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں جو سیاست سے بہت دور ہے۔ میں ہمیشہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا لیکن میرا مطالعہ زیادہ تر گاڑیوں کے اندر ہو جاتا ہے جب میں اس وسیع ملک میں اِدھر سے اُدھر سفر کرتا ہوں۔

انٹر یا تیسرا درجہ پڑھنے یا کوئی اور کام کرنے کے لیے ایسی جگہ نہیں ہے جیسی ہونی چاہیے لیکن بالعموم میرے ساتھی مسافروں کی دوستانہ روش اور ریلوے کے حکام کی مہربانی سے بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں ایسے سفر میں جو تکلیفیں کہ مسافروں کو پیش آتی رہتی ہیں ان کے تجربے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بعض حضرات اپنے حصے سے زیادہ جگہ لینے کے لیے مجھ سے اصرار کرتے ہیں اور ایسی عنایتوں کے بہت سے واقعات سفر میں ایک خوش گوار انسانی ہمدردی کا عنصر پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں تکلیفوں کا شائق ہوں یا ان کی تلاش کرتا ہوں۔ نہ یہی صحیح ہے کہ میں تیسرے درجے میں اس لیے سفر

کرتا ہوں کہ اس میں کوئی خوبی ہے یا ایسا نہ کرنے میں کسی اصول کی شکست کا خوف ہے۔ اصل سوال روپے کا ہے۔ تیسرے اور دوسرے درجوں کے کرایوں میں اس قدر فرق ہے کہ صرف بہت ہی شدید ضرورت مجھے دوسرے درجے کے پُرعیش سفر پر مائل کرتی ہے۔

ایک زمانے میں جسے اب بارہ برس ہوتے ہیں، میں حالتِ سفر میں خاص طور پر کانگریس کے متعلق خطوط لکھنے کا کام بہت زیادہ کیا کرتا تھا۔ مختلف ریلوے لائنوں پر بار بار کے تجربے نے مجھ میں یہ اندازہ لگانے کی اہلیت پیدا کر دی تھی کہ تحریر کی آسانی کے لحاظ سے کون لائن بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سلسلے میں پہلی جگہ ایسٹ انڈین ریلوے کو دی نارتھ ویسٹرن بھی بری نہیں لیکن جی آئی پی یقیناً بُری ہے وہ انسان کے سارے جسم کو ہلا دیتی ہے ایسا کیوں ہے۔ میں ٹھیک طور سے نہیں بتا سکتا نہ مجھے یہی معلوم ہے کہ حکومت کے قبضے کی مختلف گاڑیوں کے کرایوں میں ایک دوسرے سے اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس طرح بھی جی، آئی، پی ریلوے سب سے زیادہ گراں پڑتی ہے یہاں تک کہ اس کے یہاں معمولی واپسی کے ٹکٹ بھی نہیں ملتے۔

اب میں نے ٹرین میں زیادہ لکھنے کی عادت ترک کر دی ہے شاید اب میرے جسم میں اتنا لوچ نہیں رہا کہ وہ چلتی ہوئی ٹرین کے جھٹکوں میں لکھنے کے لیے توازن قائم رکھ سکے لیکن میں سفر میں ایک بکس بھر کر کتابیں ساتھ لے جاتا ہوں یہ کتابیں اس سے بہت زیادہ ہوتی ہیں جتنی میں پڑھ سکتا ہوں۔ چاہے ایک شخص پڑھنے کا موقع نہ پا سکے۔ لیکن اپنے گرد و پیش کتابوں کی موجودگی ہی سے ایک طرح کا اطمینان بخش احساس اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔

میرا یہ سفر طولانی تھا۔ ہوائی جہاز کے متعدد سفر کے بعد مجھے کراچی کی لمبی مسافت جیسے یورپ کا آدھا راستہ معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے میرا بکس مختلف طرح کی کتابوں سے اچھی طرح بھرا ہوا تھا۔ جیسا کہ میرا طریقہ تھا میں انٹر میں سوار ہوا۔ لیکن دوسرے دن لاہور پہنچ کر جب مجھے راستے میں پڑنے والی گرمی اور گرد و غبار کی خوفناک پُرخطر خبریں ملیں تو میرا ارادہ کمزور ہو گیا اور میں نے ٹکٹ دوسرے درجے کا بنوا لیا اس طرح باقاعدہ اور یک گونہ آرام دہ سفر میں میں نے سندھ کا ریگستان عبور کیا۔ یہ ایک لحاظ سے بہت اچھا ہوا کیونکہ یہاں بند ڈبوں میں بھی گرد و غبار کے باریک ذرّے سوراخوں اور درازوں سے چلے آتے تھے۔ ہم پر گرد کی تہہ پر تہہ جمتی چلی جا رہی تھی اور سانس لینے میں ہوا بھاری معلوم ہوتی تھی۔ میں نے

تیسرے درجے کا خیال کیا اور کانپ گیا۔ میں گرمی اور اس سے زیادہ تکلیف دہ چیزیں سہہ سکتا ہوں لیکن گرد کا برداشت کرنا مجھے بہت زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اس لمبے سفر میں میں نے ایک کتاب ایک عجیب اور غیر معمولی شخص ایڈورڈ ولسن EDWARD WILSON کے متعلق پڑھی جو چڑیوں اور جانوروں سے عشق رکھتا تھا اور جو انٹارکٹک (بحر قطب جنوبی) کے منجمد علاقوں میں آخر وقت تک اسکاٹ کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس کتاب میں میرے لیے دہری کشش تھی کیونکہ یہ مجھے ایک دوسرے عجیب و غریب انسان سے ملی تھی یہ اے۔جی۔ فریزر A.G. FRAZER کا تحفہ تھا۔

وہ اے۔جی۔ فریزر جو عرصہ تک مغربی افریقہ کے اچی موتا کالج کے پرنسپل رہے۔ یہ جگہ افریقی تعلیم و تربیت کی وہ اعلیٰ اور انوکھی یادگار ہے جسے انھوں نے محنت محبت اور ہمدردی سے تیار کیا تھا۔

سندھ کا غیر متواضع ریگستان ختم ہوا۔ گاڑی اپنی دھن میں چلی جارہی تھی اور میں انٹارکٹک میں دشمن عناصر کے خلاف انسانی دلیری، فطرت پر فتح پانے والی ہمت اور ناقابلِ یقین قوتِ برداشت کے واقعات پڑھنے میں لگا ہوا تھا۔ دوستوں کے ساتھ بے پناہ وفاداری اور محنت و مشقت، خود فراموشی اور ہر ممکن مصیبت کے ہوتے ہوئے زندہ دلی کا اظہار قدم قدم پر ہو رہا تھا۔ اور یہ سب اپنے ذاتی نفع کے لیے نہیں اور نہ یہ بظاہر عام لوگوں یا سائنس کے فوری فائدے کے لیے۔ سوال ہوگا تو پھر کیوں؟ صرف اس لیے کہ انسان میں ایک طرح کی دلیری و جرأت ہے یک روح ہے جو شکست نہیں کھاتی بلکہ لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر جانے کی راہیں تلاش کرتی رہتی ہے۔ ستاروں سے کوئی آواز اس کے لیے آتی ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر اس آواز کو نہیں سنتے لیکن یہی بہت خوب ہے کہ کچھ لوگ سن لیتے ہیں اور ہماری موجودہ نسل کا معیار اونچا کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے زندگی ایک مسلسل دعوتِ مقابلہ ہے، ایک نامعلوم پر خطر مہم ہے، ان کی قوت آزمانے کی ایک کسوٹی ہے۔

"میں زندگی کو روح کی قوت آزمانے کے لیے ایک چیز سمجھتا ہوں"

ایڈورڈ ولسن ایسا ہی تھا اور یہ بھی کتنا اچھا ہوا کہ قطب جنوبی تک پہنچنے کے بعد

وہ اور اس کے رفقار کار ابدی آرام کے لیے انٹارکٹک کے وسیع ملک میں لیٹ رہے جہاں طویل دن کے بعد طویل رات آتی ہے اور ہر وقت سکون چھایا رہتا ہے وہ اس وسیع البسط میدان میں برف اور اولے سے گھرے ہوئے سو رہے ہیں اور انسانی دستکاری نے ان کے اوپر یہ موزوں کتبہ کھڑا کر دیا ہے۔

"کوشش کرنا جستجو کرنا اور پا جانا مگر شکست نہ کھانا"

قطبین فتح ہو چکے، ریگستان چھانے جا چکے، اونچے پہاڑ انسانوں کے قابو میں آ گئے اگرچہ ایورسٹ کی بلند چوٹی آج بھی غیر مفتوح اور مغرور کھڑی ہے۔ لیکن انسان ضدی اور جفاکش ہے اور ایوسٹ کو اس کے سامنے سر جھکانا پڑے گا کیونکہ اس کے مختصر سے جسم میں ایک دماغ ہے جو مشکلوں کو دھیان میں نہیں لاتا اور ایک روح ہے جو ہارنا نہیں جانتی ہے۔ پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ زمین چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے اور انسانوں کی روحانی بلند پروازی اور ذوقِ تجسس اس سے باہر جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قطبین تک اڑنا تھوڑے ہی دنوں میں ایک معمولی بات ہو جائے گا۔ بجلی کے تاروں پر چلنے والی معلق گاڑیاں پہاڑوں کے دامن سے گزرتی ہیں، بلندیوں پر آرام دہ ہوٹل میں جہاں بینڈ رات کے سناٹے کو توڑ دیتے ہیں اور برفیلی فضا کو دائمی سکون کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کے بیکار لوگ برج کھیلتے اور بد مذاقی کی باتوں میں وقت گنواتے ہیں اور عیش و آرام کے لطف سے تھکے ہوئے نوجوان اور بوڑھے مسرت کی تلاش میں بے کار لگے رہتے ہیں۔

لیکن باہمت اور متجسس مسافر کے لیے اب بھی کافی سامان دلکش باقی ہے جن میں ہمت اور جوش ہے انھیں دنیا کی وسعتیں اپنی طرف اشارے سے بلاتی ہیں اور ستارے آسمانوں پر اپنی دعوتِ مقابلہ شہاب کی شکل میں بھیجتے ہیں کیا نا معلوم دلکش سفر کے لیے قطبین ریگستانوں اور پہاڑوں پر ہی جانا ضروری ہے جب کہ ان لوگوں کے لیے جو اس کے آرزومند ہیں یہ سب کچھ خود زندگی میں موجود ہے؟ ہم نے اپنی زندگی اور سماج کی کیسی بری حالت بنا رکھی ہے۔ دولت، خوشی اور انسانی زندگی کی آزاد ترقی کی راہوں پر قابو رکھتے ہوئے بھی ہم بھوک کی مصیبت اور غلامی کی اس ہمت کش فضا میں سانس لے رہے ہیں جو اگلے

وقتوں سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ ہمیں اس کے تبدیل کرنے میں اپنے حصے کے مطابق لگ جانا چاہیے تاکہ انسان اپنی بلند مرتبہ وراثت کے اہل بن جائیں اور اپنی زندگی کو حسن، مسرت اور دل کشی سے معمور کرلیں۔ زندگی کا سفر اشارہ کر رہا ہے اور یہی سب سے بڑا نامعلوم سفر ہے۔

ریگستان پر اندھیرا چھایا ہوا ہے لیکن ٹرین اپنی مقررہ منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ شاید اسی طرح انسانیت بھی لڑکھڑاتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ رات اندھیری ہے اور منزل ہماری نگاہوں سے اوجھل۔ جلد ہی صبح آئے گی اور اس ریگزار کے بدلے نیلا سمندر ہمارے استقبال کو سامنے آئے گا

۱۷ر جولائی ۱۹۳۶ء

---

# اپنے دوستوں اور نکتہ چینوں سے

اخباروں اور اخبار نویسوں کا بے حد شکر گزار ہوں کہ وہ ازراہِ عنایت میری تحریر و تقریر کی نشر و اشاعت کرتے ہیں میں خاص طور پر اپنے معترضوں اور نکتہ چینوں کا ممنون ہوں جو میرے لاتعداد نقائص اور بھول چوک کی طرف اشارہ کرکے مجھے صحیح راستہ دکھانے کی اتنی کوشش کرتے ہیں. میں ایسی تنقیدوں کو دوسروں کی تعریفوں سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میرے کثیر مشاغل، ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتے رہنا، بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرنا، دوستانہ اور پُرجوش مجمعوں میں ہاتھوں ہاتھ پہنچنا، بحث مباحثے، دفتر کے کام کا بوجھ اور پھر خطوں کے انبار کا مقابلہ کرنا، اس پُرشور دنیا کے ہنگاموں اور جھگڑوں سے پناہ لینے کے لیے کچھ وقت ادھر ادھر سے کاٹ کر بچا لینا اور اپنے کو کسی دلکش کتاب میں کھو دینا۔ یہ باتیں میرے لیے بہت کم وقت چھوڑتی ہیں کہ میں دوستوں اور اعتراض کرنے والوں کی فیاضانہ نصیحتوں پر پوری طرح غور کرسکوں لیکن کبھی کبھی میں ان مشوروں اور تنقیدوں کے سمندر میں غوطہ لگاتا ہوں اور اپنے فطری حلم کے باوجود ایک ابھار کا جذبہ مجھ پر اس خیال سے طاری ہوجاتا ہے کہ میرے منہ سے اتفاقیہ طور پر نکلے ہوئے الفاظ بھی لوگوں کے دلوں میں حرکت پیدا کرتے ہیں آگرچہ کبھی کبھی یہ حرکت غصّے کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔

مجھے شکایت نہ کرنی چاہیے اگر بولنے اور لکھنے کی اس کثرت میں کبھی کبھی غلطیاں ہوجاتی ہیں الفاظ اپنا ربط کھو دیتے ہیں یا فرضی باتیں میرے سر منڈھی جاتی ہیں اور میری مزاح

پیدا کرنے کی کوشش سمجھی نہیں جاتی یا سنجیدگی سے اس کا اثر لیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی راہ کافی سخت ہے اور اگر اس میں خوش طبعی کا پہلو نہ پیدا کیا جائے تو اس بوجھ کا اٹھانا مشکل ہو جائے یہ بات کافی بُری ہے کہ میں اتنی تقریریں کرتا ہوں اور پھر اگر ان تقریروں کے متعلق ہر غلط رپورٹ کی تصحیح اور ہر غلط ترجمانی کی درستگی بھی کرتا رہوں تو زندگی تلخ ہو جائے۔ جو سوالات مجھ سے پوچھے جاتے ہیں وہ مستزاد ہیں۔ ان کی تعداد کی انتہا نہیں اور نہ ان کی قسموں کی حدود خدا اور مذہب سے لے کر شادی، اخلاقیات، جنسیات، زمین پر خدا کے سایہ (بادشاہ) سرمایہ داری اور ملکیت تک کے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ سوالات شاذ و نادر ہی میرے بیانات سے یا ملکی مسائل سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ چیز نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کس طرح میرے معترضین میری کہی ہوئی باتوں سے آنکھ بچا کر گزر جاتے ہیں اور دوسری باتوں پر وقت اور زور صرف کرتے ہیں۔

پھر بھی مجھے ان سوالات میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور میں بہ خوشی انھیں حل کرنے میں لگ جاتا اگر عمر اتنی مختصر نہ ہوتی اور زندگی کے دن گنے ہوئے نہ ہوتے۔ بدقسمتی سے ہم ان حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ ہم اپنی جوانی اور اس کے بعد کا حصہ سیاسیات کی خشک فضا میں رہ کر "کمیونل اوارڈ" (فرقہ وارانہ فیصلہ) اور مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر جوش کا مظاہرہ کرنے میں ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی اور زندگی کے حقیقی مسائل پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں رہتا۔ بہرحال زندگی کے اصل مسائل ہیں، انسانوں کے معاشرتی، قلبی اور روحانی تعلقات اور انسان کا سماج سے تعلق۔ ہم ان کو پوری طرح دیکھ بھی نہیں سکتے ان کا سلجھانا تو بڑی بات ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سیاسی اور اقتصادی نظام نے جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ہماری نظر دھندلی کر دی ہے اور ہمارے جسم کو جکڑ دیا ہے۔

اس لیے موجودہ حالات میں میں ان سوالوں کا جواب دینے میں اپنا وقت نہیں لگا سکتا بلکہ سوال کرنے والے سے اپنی خود نوشت سوانح عمری دیکھنے کی طرف اشارہ کروں گا جہاں انسان اور دوسری چیزوں کے متعلق میرے عام تصوّرات ملیں گے۔ لیکن پھر بھی میں اس وقت بالکل خاموشی اختیار نہیں کر سکتا جب میرے رفقارِ کار کے متعلق فضول اور لاحاصل باتیں

کہی جاتی ہیں اور میرے الفاظ سند کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کی طرف برابر اشارے ملتے ہیں کہ مجھ میں اور میرے ساتھیوں میں مسلسل کشمکش ہے، کانگریس میں بہت جلد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے اور بڑے اہم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میرے کچھ الفاظ جو میں نے خواتین کے ایک جلسے میں بمبئی میں کہے تھے بگاڑ دیے گئے ہیں تاکہ ان سے وہ مطلب حاصل کیا جائے جو کچھ میرے ذہن میں نہیں تھا۔

مجھے یقین ہے کہ میں نے لکھنو میں اور لکھنو کے بعد بھی نہایت آزادی سے اپنے اور کانگریس کی مجلسِ انتظامیہ کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کی غیر متعین پوزیشن کو صاف کر دیا ہے۔ یہ عجیب اور کسی قدر پریشان کن صورتِ حال میرے اشتراکی عقائد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہ صرف سیاسی اختلاف تھا جو لکھنو میں ظاہر ہو کر سب کے سامنے آیا۔ ہم میں سے کسی نے اسے راز بنا کر نہیں رکھا کیونکہ ہمیں اس کا احساس تھا کہ ان اہم اور بنیادی مسائل پر جن کا تعلق عوام سے ہے ہمیں صاف گوئی اور ذہنی بے تعلقی سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہی ہندوستان کی قسمت کے آخری فیصلہ کرنے والے ہوں گے اس لیے ہم اختلاف ہی پر اور کھلے ہوئے اختلاف پر رضامند ہو گئے لیکن اس کے بعد ہم امداد باہمی اور اتحادِ عمل پر بھی رضامند ہوئے۔ یہ صرف اس لیے نہیں کہ ہمارے سامنے ہندوستان کی آزادی کا بزرگ تر سوال تھا جسے ہم دل سے عزیز رکھتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارے درمیان اتفاق اور اتحاد کے نکات زیادہ تھے اور اختلاف رائے کے بہت کم۔ یقیناً ہمارے زاویۂ نگاہ میں اختلاف تھا اور بعض چیزوں پر زور دینے میں فرق تھا۔ یہ سب کچھ سیاسی تھا اشتراکی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو صرف اس حد تک کہ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اور بعض چیزوں پر زور دینا اشتراکیت ہی نے پیدا کیا تھا۔ لکھنو کی کسی تجویز میں وہ چیز نہیں ظاہر ہوئی جسے اشتراکی کہہ سکیں۔ اشتراکیوں نے بھی اسے محسوس کیا کہ اصل مسئلہ سیاسی یعنی آزادی کا تھا اور اسی پر انھوں نے اپنے خیالات جما دیے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مل کر کام کرنے پر رضامندی کا اظہار کر کے میرے ساتھ کام کرنے والوں نے میرا اور میرے خیالاتِ پریشان کا جو احترام کیا ہے میں اس کے لیے دل سے ان کا شکر گذار ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے اور ایک مرتبہ میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی

اس کا تذکرہ کیا ہے کہ میں کسی قدر تکلیف دہ ہوں۔ میں وہاں کو دپڑنا اور دوڑ جانا چاہتا ہوں جہاں عقل مند اور دوربین حضرات موقع اور محل کا خیال کریں گے۔ تاہم انھوں نے مجھے اور میرے مخصوص خیالات کو برداشت کیا۔ اختلاف اور اس قسم کی باتوں کا ذکر بے وقوفی ہے۔ ہمارے محاذ میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ آزادی ہمیں آواز دیتی ہے اور خون ہماری رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ ہم متفق ہوں یا اختلاف رکھیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جائیں لیکن ہم پھر بھی اُس آواز پر ساتھ ہی جائیں گے اور اُن تمام لوگوں کو جو اس آواز کو سنتے اور اس پر لبیک کہتے ہیں ہم اپنے درمیان آنے کے لیے خوش آمدید کہتے ہیں چاہے اُن کے خیالات دوسرے مسائل پر جو کچھ ہوں۔

ایک بار پھر میرے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ میں نے کھادی کے بارے میں کچھ اہانت آمیز باتیں کہی ہیں۔" میں نے یہ بار ہا کہا ہے کہ میں کھادی کو ملک کی اقتصادی خرابیوں کا آخری علاج نہیں سمجھتا اس لیے میں اُس مشکل کا آخری حل کہیں اور تلاش کرتا ہوں"۔ لیکن پھر بھی آج ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ کھادی کی ایک خاص سیاسی معاشرتی اور اقتصادی اہمیت اور قیمت ہے اس لیے اس کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔

لیکن زیادہ تر سوالات کا تعلق اشتراکیت (سوشلزم) سے ہوتا ہے جن سے نہ صرف لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس جوش کا بھی جو ذہن کو تاریک بنا دیتا ہے۔ سوشلزم ایک اقتصادی اصول ہے۔ یہ پیداوار تقسیم اور دوسرے سماجی مسائل کے باقاعدہ ترتیب دینے کا ایک طریقہ ہے۔ اس کے پیرؤوں کے خیال کے مطابق اشتراکیت موجودہ سماج کی تمام خرابیوں کا حل ہے لیکن اس اقتصادی نظام پر غور کرتے ہوئے ہم برابر مذہب اور خدا کو درمیان میں لایا کرتے ہیں اور بادشاہ چارلس اول کے سر کی طرح روس برابر ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں قادر مطلق اور مختلف پُراسرار اور عجیب پرستش کے طریقوں پر بحث کرنے کو بالکل تیار ہوں۔ میں روس کے متعلق بھی گفتگو کر سکتا ہوں کیونکہ آج کل روس میں بڑی دلکشی ہے مگر مجھے خاص مسئلہ سے ہٹا لے جانے پر اعتراض ہے یہ بات صرف ذہنی انتشار یا اصل سوال سے عمداً بچنے کی وجہ سے پیدا

ہو سکتی ہے ۔

مذہب کے معاملے میں میں اسے بالکل مانتا ہوں کہ عقائد اور اعمال کی مکمل آزادی ہونی چاہیے ۔ لوگ خدا کی عبادت ہزاروں طریقوں میں سے کسی طریقے سے کر سکتے ہیں لیکن میں اس کے لیے بھی آزادی چاہتا ہوں کہ اگر میرا جی چاہے تو میں کسی شکل میں خدا کی پرستش نہ کروں اور جن باتوں کو میں وہم پرستی اور سماج کی دشمنی تصور کرتا ہوں اس سے لوگوں کو روکوں لیکن جب مذہب شخصی مفاد اور سرمایہ داری کے بھیس میں آتا ہے اور لوگوں کو لوٹتا ہے تو اُسے مذہب نہ سمجھنا چاہیے اور اس کا مقابلہ کرنا چاہیے ۔

میں اس بنیادی اقتصادی نظریہ پر اعتقاد رکھتا ہوں جو روس کے معاشرتی نظام کی تہہ میں ہے ۔ میرا خیال ہے کہ روس نے تمدن، تعلیم اور اگر میں روحانیت کے لفظ کو اس کے صحیح مفہوم میں استعمال کر سکوں تو روحانیت میں بھی حیرت خیز ترقی کی ہے ۔ لیکن پھر بھی میں ہر اس بات کو جو وہاں جاری ہے پسند نہیں کرتا اور اسی لیے میں روس کی کورانہ تقلید کی رائے بھی نہیں دیتا ۔ یہی وجہ ہے کہ میں سوشلزم (اشتراکیت) کے لفظ کو کمیونزم (اجتماعیت) پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آخرالذکر لفظ سوویت روس کا مترادف بن گیا ہے ۔ بمبئی کے بعض سربرآوردہ کاروباری میرے کمیونزم کے بدلے شوشلزم کے لفظ کے استعمال پر بہت اعتراض کرتے ہیں بظاہر ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے اہلِ وطن کو دھوکا دیتا ہوں ۔ اس مسئلہ پر انھیں اس قدر جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ میں کمیونزم کے لفظ سے ڈرتا نہیں ۔ میری سرشت ہی میں یہ ہے کہ میری تمام ہمدردیاں سب سے زیادہ مظلوم اور سب سے زیادہ دبی ہوئی چیزوں کے ساتھ ہوتی ہیں ۔ جبکہ حکومت کی ساری قوت اور ذاتی مفاد کمیونزم کے کچلنے میں صرف ہو رہے ہیں ۔ یہی چیز کمیونزم کی طرف میری رغبت اور ہمدردی کا کافی بڑا سبب ہو سکتی ہے ۔ دوسرے لوگ اور راستہ اختیار کرتے ہیں اور فطری طور پر قوی اور زبردست سے ملنے پر مائل ہوتے ہیں ۔ ہندوستان میں یہ قوت برطانوی سامراج ہے ۔

لیکن الفاظ اور نام پراگندگی پیدا کرتے ہیں ۔ میں جس چیز کی جستجو میں ہوں وہ یہ ہے کہ

سماج سے نفع حاصل کرنے کا جذبہ نکل جائے، مقابلے کی جگہ خدمت اور امدادِ باہمی لے لے اور پیداوار منافع کے لیے نہیں بلکہ استعمال کے لیے ہو۔ چونکہ میں تشدد سے نفرت کرتا ہوں اور اسے ذلیل چیز سمجھتا ہوں اس لیے میں خوشی سے موجودہ نظام کو پسند نہیں کرسکتا جس کی بنیاد ہی تشدد پر ہے اسی سبب سے میں اور زیادہ پُرامن اور پائدار نظام تلاش کرتا ہوں جس سے تشدد کی جڑیں نکال کر پھینکی جاچکی ہوں، جہاں نفرت نے سکڑ کر شریفانہ جذبات کے لیے جگہ خالی کردی ہو۔ میں ان چیزوں کا نام سوشلزم رکھتا ہوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہندوستان میں کس طرح آئے گی، کن کن منازل سے ہوکر گزرے گی اور کن دشواریوں پر قابو پائے گی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بغیر کسی اس قسم کی کوشش کے ہم افلاس اور بے کاری کے مسائل حل نہ کرسکیں گے۔ اگر دوسرے طریقے بھی ہیں تو میرے معترض کسی ایسی چیز پر خفا ہونے کے بجائے جسے وہ پسند نہیں کرتے یا شاید سمجھتے نہیں انھیں ملک کے سامنے پیش کیوں نہیں کرتے؟

لیکن قبل اس کے کہ یہاں سوشلزم آئے یا اس کی کوشش بھی کی جائے ہمارے ہاتھ میں اپنی قسمت بنانے کے لیے طاقت بھی ہونی چاہیے، ہمیں سیاسی آزادی ملنی چاہیے۔ ہمارے سامنے یہی سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ ہے اور چاہے ہم سوشلزم کو مانیں یا نہ مانیں اگر ہم حقیقتاً آزادی کے خواہاں ہیں تو ہمیں اپنی قوتوں کو متحد کرکے اسے ان ہاتھوں سے چھیننا ہے جو اسے چھوڑنے پر رضامند نہیں ہیں۔

میں مکمل جمہوریت کو مانتا ہوں یعنی سیاسی اور اقتصادی دونوں طرح کی آزادی حت ٗ ہو۔ فی الحال میں سیاسی جمہوریت کے لیے کام کر رہا ہوں لیکن سمجھتا ہوں کہ یہی چیز بڑھ کر اور پھیل کر معاشی جمہوریت بھی بن جائے گی۔ کانگریس نے ہمارے سامنے ان مسائل کے حل کرنے کا جو ذریعہ ممکن ہے وہی رکھا ہے اور وہ کانسٹوئنٹ اسمبلی

کا ہے میری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ جو شخص جو لینے کو جمہوریت پسند کہتا ہے کس طرح اس سے اختلاف رکھ سکتا ہے اور دوسرا راستہ تلاش کرسکتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ہندوستان کے لاکھوں بے سمجھ لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جیسا کہ بمبئی کے اعلان میں

۱۲۱ دستخط کرنے والوں نے کیا اور ان کے سامنے ملک کے اہم مسائل پیش کرنے پر اعتراض کرتے ہیں غالباً جمہوریت پسند کہلانا پسند نہ کریں گے۔

کیا ہم اپنے مسائل کا کوئی جمہوری حل چاہتے ہیں؟ ۔ یہ ایک سوال ہے جو اپنے معترضین سے پوچھنا چاہوں گا۔ اگر ایسا ہے تو پھر جب میں انہیں عوام کے سامنے رکھتا ہوں اور انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ شور وغوغا، یہ غصّے میں بھرے ہوئے جذبات کیوں بلند کیے جاتے ہیں؟ ۔ میں نے اتفاقاً کہنے کے علاوہ شاید ہی کبھی سوشلزم کا ذکر ان سے کیا ہو۔ ہاں میں نے اپنے ملک کے حیرتناک افلاس، اپنے کسانوں، مزدوروں اور متوسط طبقے کے لوگوں کی بے کاری اور اس کے علاوہ سب سے اونچے درجہ کے تھوڑے سے لوگوں کے دوسرے طبقوں کے تیز زوال پر البتہ زور دیا ہے۔ ان تھوڑے سے لوگوں کی نگاہ میں یہی میرا گناہ ہے ۔لیکن جب ہندوستان کے متعلق سوچنے لگتا ہوں تو میرے سامنے یہی ایک تصویر آتی ہے ۔ چاہے میں کوشش بھی کروں مگر اس خیال سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ یہ کوئی خوش گوار تصویر نہیں ہے ۔میں اسے پسند نہیں کرتا بلکہ جب اسے دیکھتا ہوں تو کبھی میرا خون سرد ہو جاتا ہے اور کبھی نفرت اور غصّے سے کھولنے لگتا ہے کہ کیا ایسا ہی ہونا چاہیے ۔

۵ر جون ۱۹۳۶ء

---

# تامل ناڈ کو خیر باد کہتے ہوئے

تامل ناڈ کے مردو اور عورتو!

میں دو ہفتے آپ کے صوبے میں اِدھر اُدھر پھرا ہوں اس سفر میں میں نے آپ کے مشہور شہر اور بہت سے گاؤں دیکھے۔ میں نے سیکڑوں جلسوں میں عورتوں اور مردوں کے عظیم الشان مجمعوں میں تقریریں کیں۔ ان دو ہفتوں میں ہم اکٹھا رہے اور کافی وقت ساتھ ساتھ بسر کیا۔ شاید ہم ایک دوسرے کو پہلے سے کچھ زیادہ سمجھنے بھی لگے ہیں۔

اب پھر میں شمال کو واپس جا رہا ہوں اور جاتے وقت نہ جانے کتنی یادیں میرے ذہن پر چھائی جا رہی ہیں۔ یہ یادیں لہریں لیتے ہوئے مجمعوں، دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے جوش چمکتی ہوئی آنکھوں اور ان کے اندر سے خاموش جھانکتے ہوئے معاہدوں سے متعلق ہیں۔

میں آپ کے پاس کانگریس کا پیام لایا یہ پیام آپ کے لیے نیا نہ تھا۔ تاہم آپ نے کانگریس اور ملکی آزادی کے عہدِ وفاداری کو گراں قدر پیمانے پر نئے انداز سے ظاہر کیا۔ افراد آتے اور جاتے رہتے ہیں لیکن نصب العین رہ جاتا ہے اور ہمیں اشتراک اور اتحاد کی زنجیروں میں باندھتا ہے اس سفر میں ایک بہت بڑی مہم یہ اتفاق و اتحاد کا تصور برابر میرے ساتھ رہا۔ ہندوستان کا وہ اتحاد جو ان اختلافات اور پابندیوں کو توڑ دینا چاہتا ہے جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ میں بالکل بھول گیا کہ میں اپنے گھر سے بہت دور جنوب میں ہوں۔ صرف ایک خیال تھا، وہ تھا ہندوستان کی آزادی کا خیال۔ اور یہ کہ ہم سب ایک دوسرے کے دوست

اور ساتھی تھے جو شانہ بہ شانہ اپنے دل کی لگن پوری کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ ہندوستان کی محبت سے ہمارے دل بھرے ہوئے تھے اور ہم شوق اور سرگرمی سے آنے والی آزادی کا انتظار کر رہے تھے۔

اس آزادی کی محبت کے ساتھ ساتھ سماجی آزادی کا جوش بھی دلوں میں موجزن تھا۔ ایک خواہش تھی کہ ہمارے اہلِ وطن کی تاراجی کا سلسلہ ختم ہو اور ایک زیادہ منصفانہ نظام قائم ہو جو افلاس کے اسباب کا خاتمہ کر دے اور اس بیکاری سے نجات دلائے جس میں ہمارے گلے پھنسے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مجمع جو مجھے سننے کے لیے جمع ہوتے تھے زیادہ تر ننگے بھوکے اور اپنے تباہ کن بوجھ سے چھٹکارا پانے والے لوگوں سے بھرے ہوتے تھے۔ ان کے اور ہمارے دماغوں میں سیاسی آزادی اور سماجی آزادی کا تصوّر ایک دوسرے سے ملا ہوا تھا اور جس مستقبل کے لیے ہم کوشاں تھے یہی اس کے دو رخ تھے۔

لیکن اس حیرتناک جوش اور بے پناہ اظہارِ محبت میں ضبط اور تنظیم پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یہ ضائع نہ ہو جائیں۔ کانگریس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی کوشش کی ہے لیکن ہمیں ابھی اور آگے جانا چاہیے اور اس قوت کو ہندوستان کی آزادی اور کانگریس کے کام میں لگا دینا چاہیے اس کے لیے کانگریس کو اپنی اپیل کی طرح اپنے نظام کو بھی ہر گاؤں میں پھیلانا چاہیے اور ہر جگہ وسیع جمہوری بنیاد پر کام کرنا چاہیے۔ رہنمائی ضروری ہے لیکن تحکم پسندی بری ہے اور برطانوی اقتدار کی وجہ سے ہم یوں ہی اس میں کافی مبتلا ہیں۔

بعض مقامات پر ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے انتخابات کے سلسلے میں مقامی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض تو یقیناً کانگریس امیدوار کے انتخاب میں کسی کمزوری کی وجہ سے تھے۔ ایسے لوگ چنے گئے تھے جو کانگریس کی سچی روح اپنے اندر بہت کم رکھتے تھے اس لیے آخر کار وہ یہ بڑا کھیل نہ کھیل سکے اور کبھی کبھی تو انھوں نے اپنے معاہدے بھی توڑ دیے۔ اس راستے میں خطرے ہیں۔ ہماری قوت گھٹ جائے گی اور ہمارا نصب العین دھندلا ہوتا چلا جائے گا اگر ہم نے تعداد کی فکر میں پڑ کر اپنی خصوصیتوں کا معیار گھٹا دیا۔ اس لیے کچھ بھی ہو جائے ہمیں اپنے مقاصد کی بلندی سے نیچے نہیں آنا چاہیے۔

ہمارے جلسوں میں عورتیں حیرت خیز تعداد میں شریک ہوتی رہیں اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کسی حد تک ان میں بھی سیاسی بیداری پیدا ہو گئی ہے ۔ ان میں یہ بیداری دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس قومی اور سماجی جدوجہد میں ان کا بھی پوری طرح حصہ لینا لازمی ہے۔

ہمارے سامنے بڑے بڑے مسائل ہیں ۔ انھیں حل کرنے کے لیے ہمیں بھی بڑا بن جانا چاہیے ۔ معمولی اور دوسرے درجے کے مسئلوں کو کبھی اس کا موقع نہ دینا چاہیے کہ وہ ہمارے دماغوں میں پہلی جگہ لے لیں ۔

مجھے اس محبت کے لیے جو آپ نے دکھائی آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہونا چاہیے لیکن یہ سب کچھ کانگریس کے لیے تھا کیونکہ میں کانگریس کا پیامبر بن کر کانگریس کے صدر کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا تھا ۔ اس پیام کو نہ بھولیے اور یہ بھی نہ بھولیے کہ سچا جوش عمل کی طرف ہدایت کرتا ہے، ہمارا متحدہ عمل کانگریس کے جھنڈے کے نیچے منظم ہونا چاہیے جو کانگریس کے مقاصد کو آگے بڑھا سکے ۔

اب میں واپس جا رہا ہوں لیکن میں اس سفر کو بہت دنوں تک یاد رکھوں گا ۔ میں تامل ناڈ کے رفقائے کار کا پیام دوسری جگہ کے لوگوں تک پہنچاؤں گا ۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء

# کانگریس اور اشتراکیت

اشتراکیت اچھی ہو یا بُری، مستقبل بعید کا ایک خواب ہو یا حال کا مسئلہ، یہ جو کچھ بھی ہو یا جو کچھ ہو سکتی ہو، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے دماغ میں اس نے بڑی جگہ اپنے لیے پیدا کر لی ہے۔ یہ لفظ اِدھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے اور ہم کو بڑی سنجیدگی سے بتایا جاتا ہے کہ اس کی آڑ میں کمیونزم کی خوفناک پرچھائیں گھات لگائے ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اس کے بہت سے نقادوں کی معلومات کہ سوشلزم کیا ہے۔ بہت ہی دھندلی اور ناکافی ہے اور پیشہ ور ماہر اقتصادیات بھی حکومت کا پروپیگنڈا کرنے والوں کی طرح مسئلے کو الجھانے کے لیے خدا، مذہب، شادی اور عورتوں کی تذلیل کا ذکر درمیان میں لاتے ہیں۔ ہمیں شکایت نہ کرنا چاہیے اگرچہ ان لوگوں کو الف بے کی تعلیم دینا جو کہتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ سکتے ہیں بہت ہی تھکا دینے والا عمل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے خلاف سب سے زیادہ شور و شغب انھیں لوگوں کی طرف سے اٹھتا ہے جو اس سے نفرت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ اس خیال اور اس لفظ کا ذکر ہی نہ کیا جائے۔

سوشلزم (اشتراکیت) جیسا ہر اسکول کے طالب علم کو بھی جاننا چاہیے ایک معاشی نظریہ ہے جو ان مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو موجودہ دنیا کو پریشان کر رہے ہیں۔ یہ تاریخ پر نظر ڈالنے اور اس کی پیچیدہ رفتار سے ان اصولوں کے اخذ کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے جو انسانی سماج پر حاوی ہیں۔ انسانوں کی بہت بڑی تعداد اس پر اعتقاد رکھتی ہے اور اسے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ بحرالکاہل سے لے کر بحر بالٹک تک ایک بہت بڑا قطعۂ زمین

اسی نظام کے ماتحت ہے۔ دوسرے بڑے بڑے ملک جیسے فرانس اور اسپین اس کے گرد منڈلا رہے ہیں اور دنیا میں مشکل ہی سے کوئی ایسا ملک ملے گا جہاں اس کے بہت سے ماننے والے موجود نہ ہوں۔ اس کی حقانیت نہ تو ان دماغوں سے اور نہ اس تعداد سے قائم ہو سکتی ہے جو اس کی پشت پر ہیں لیکن اس کے اصول ہم ہندوستان کے رہنے والوں سے سنجیدہ اور باعزت غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ہمیں اپنے اقتصادی اور سیاسی مسائل کی جانب متوجہ کر دیتے ہیں اور پُر زور طریقے پر ان کا حل چاہتے ہیں۔ غور و خوض کرنے کے بعد ہم اسے بالکل ناپسند کر سکتے ہیں یا تھوڑا بہت اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں اگرچہ ہم اس کو پوری طرح قبول کرنے پر تیار نہ ہوں۔ اس اہم امنگ کو جو لاکھوں آدمیوں کو حرکت میں لاتی ہے اور بہت سے لوگوں کے دل و دماغ دونوں پر چھا جاتی ہے ایک دم سے نظر انداز کر دینا کسی طرح عقلمندی کا کام نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ بات ٹھیک کہی جاتی ہے کہ ہمارے یہاں سیاسی سوال منظر پر قبضہ کیے ہوئے ہے اور آزادی کے بغیر اشتراکیت یا معاشی نظام میں کسی اور انتہا پسند تبدیلی کی تمام گفتگو حماقت ہے سوشلزم کے متعلق بات چیت بھی پیچیدگی پیدا کرتی ہے اور ہماری جماعت میں انتشار کا سبب ہوتی ہے۔ ہمیں سیاسی آزادی اور صرف سیاسی آزادی کے خیال کو مرکز بنا لینا چاہیے۔ یہ دلیل غور و فکر چاہتی ہے کیونکہ ہمیں کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جو سامراج کے خلاف ہمارے متحدہ محاذ کو توڑ کر ہمیں کمزور بنا دے۔ سخت سے سخت اشتراکی بھی ان دلیلوں کو کسی حد تک مان لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مانتا ہے کہ فی الحال ہمارا سب سے اہم مقصد سیاسی آزادی ہے۔ ہر چیز خود ہی اس کے بعد آئے گی اور بغیر اس کے ہم کوئی انقلاب انگیز تبدیلی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

یہاں تک تو باتیں مشترک ہیں۔ قومیت ہمارا پہلا جذبہ اور پہلی لگن معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی اس مشترک نصب العین کو سب ایک ہی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم میں سے کوئی اپنی جماعت میں افتراق پیدا کرنا نہیں چاہتا اور اپنے طاقتور مخالف کے مقابلے میں ہم برابر ایک متحدہ محاذ کی بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہم مفاد کے

اختلاف کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور جوں جوں ہم سیاسی حیثیت سے آگے بڑھتے ہیں (سوشلزم یا اقتصادی مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں) یہ اختلافات اور واضح ہو جاتے ہیں، جب کانگریس انتہا پسندوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو اعتدال پسند کنارہ کش ہو گئے۔ ایسا کسی اقتصادی بنا پر نہیں ہوا بلکہ صرف اس وجہ سے کہ ہم سیاسی حیثیت سے ترقی پسند ہوتے جاتے تھے اور اعتدال پسند عنصر شعوری یا نیم شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگا کہ اتنی ترقی پسندی ان کے مفاد کو خطرے میں ڈال دے گی۔ وہ الگ ہو گئے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس افتراق نے کانگریس کو کمزور نہیں کیا اگرچہ پرانے ساتھیوں کے چھوٹنے کا غم کچھ کم نہیں ہوا۔ کانگریس کے حلقے میں دوسرے لوگ بڑی تعداد میں آگئے اور کانگریس اور زیادہ مضبوط اور نمائندہ ادارہ بن گئی۔ بعد میں ترک موالات کا زمانہ آیا اور اس دفعہ بھی کچھ کانگریسی اکثریت کے ساتھ قدم نہ بڑھا سکے۔ انھوں نے کنارہ کشی اختیار کی لیکن کانگریس میں کمزوری نہیں آئی (اس دفعہ بھی مسئلہ سیاسی تھا اگرچہ اس کے پیچھے دوسرے مسائل بھی تھے) نئے لوگوں نے بڑی تعداد میں اس میں شرکت کی اور اپنی طولانی تاریخ میں بالکل پہلی دفعہ کانگریس غیر شہری حلقوں میں بھی ایک قوت سمجھی جانے لگی۔ اب تک تو نہیں مگر اب یہ ہندوستان کی نمائندگی کرنے لگی اور لاکھوں پر اس کے احکام اور مشوروں کا اثر پڑنے لگا۔ اسی طرح ہم جتنا بھی سیاسی طور پر آگے بڑھتے چلے گئے اتنا ہی اوپر کے مختصر گروہ اور نیچے کی بڑی اکثریت کا اندرونی اختلاف نمایاں ہونے لگا۔ انھیں ہم نے نہیں پیدا کیا۔ ہم نے یہ کیا کہ ان کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور اس طرح ہماری طاقت اور اثر میں اضافہ ہوتا رہا۔

آہستہ آہستہ دوسرے مسائل ہمارے سیاسی افق پر رنگ آمیزی کرنے لگے۔ گاندھی جی نے دیہات میں بسنے والوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے چمپارن اور کیرا میں زوردار تحریکیں چلائیں۔ یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا۔ اگرچہ نتیجتاً اس کا سیاسی ردّعمل بھی ہوا۔ انھوں نے ہماری سیاسی تحریک میں خالص قومیت کے ساتھ اسے بھی کیوں ملا دیا؟ وہ کیوں اِدھر سے اُدھر ہمارے لوگوں کے افلاس کا ذکر کرتے ہوئے پھرنے لگے؟ یہ باتیں نئی تھیں، انھیں نیا رنگ دیا گیا تھا اور ہماری تحریک کے مرکز ثقل کو شاید تبدیل کرنا تھا وہ اسے اچھی طرح سمجھتے تھے اور انھوں نے عمداً ہماری سیاسی تحریک کو اقتصادی رنگ دیا۔ کیا لاکھوں کا کانگریس کے

جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانا خاص کر اس تبدیلی اور گاندھی جی کی شخصیت کی وجہ سے نہیں تھا! ہم سب کمزوروں، اور مظلوموں کی گفتگو کرنے لگے اور وہ بُری طرح تھکے اور کچلے ہوئے کمزور لوگ اطمینان اور امید سے ہماری طرف پلٹ پڑے۔

گاندھی جی ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی غریبی پر برابر زور دینے لگے۔ ہم اصولی طور پر اس سے واقف تھے (اور کون ہندوستانی اسے بھلا سکتا تھا!) کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا' ہمارے سامنے دادا بھائی نوروجی، ڈگبی، راناڈے اور رومیش دت جیسے قدیم رہنماؤں کی تعلیمات تھیں۔ لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے یہ معاملہ بس کتابوں اور اعداد وشمار تک تھا۔ گاندھی جی نے اسے ایک زندہ سوال بنا دیا۔ اور ہم نے پہلی مرتبہ خوف زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ ہندوستان بھوکے اور مصیبت زدہ لوگوں کے گروہ کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اس بھوک اور بے کاری کو کم کرنے کے لیے وہ سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کی صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ بہت سے لوگ جو اپنے کو بہت عقلمند سمجھتے تھے اس پر ہنستے تھے۔ لیکن چرخہ چاہے غریبی کے مسئلے کو حل نہ کر سکا ہو پھر بھی بہت سی جانوں کے لیے سکون بخش ثابت ہوا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس نے ان لوگوں میں جن میں اس کی بڑی کمی تھی خود اعتمادی اور امدادِ باہمی کی روح پیدا کر دی۔ اس نے ہماری سیاسی لڑائی میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ یہاں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ ایک خارجی غیر سیاسی بات نے ہماری قومی تحریک پر اچھا اثر ڈالا۔

زمانہ مابعد میں گاندھی جی نے اچھوتوں کے مسئلے پر بھی زور دیا۔ ایسا کرنے میں جیسا کہ ضروری تھا انھوں نے بہت سے سناتن دھرمیوں کو ناراض کر دیا۔ ان پرانی رسموں کے نمائندوں اور ثروت وجاہ کے محافظوں اور ترقی پسند فرقوں میں تصادم ہوا۔ اس ڈر سے گاندھی جی نے اچھوت کے خلاف صف آرائی کرنے میں تامل نہیں کیا۔ یہ براہِ راست سیاسی مسئلہ نہ تھا پھر بھی اسے اٹھایا گیا اور ٹھیک اٹھایا گیا۔

کانگریس میں اور کانگریس کے باہر مفاد کا یہ تصادم ہر وقت ہمارے سامنے آتا رہتا ہے چاہے وہ ساردا ایکٹ ہو یا ڈاکٹر بھگوان داس کا نیا بل، چاہے کوئی سیاسی اقدام ہو جو مختلف

باتوں پر اثر انداز ہوتا ہو یا مزدور اور کسان کے متعلق کوئی بات ہو، مفاد کا یہ تصادم ضرور پیدا ہوتا ہے، ہمیں ان ٹکروں سے ضرور بچنا چاہیے لیکن جب یہ موجود ہی ہیں تو ہم انھیں نظر انداز کس طرح کر سکتے ہیں، پھر ہمیں اس کے بارے میں کرنا کیا چاہیے؟ سولہ سال تک اس بات پر زور دینے کے بعد کہ ہم عوام کے لیے کام کر رہے ہیں، جب یہ تصادم ان کے مفاد سے ہوتا ہے تو ہمارے پاس صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب وہ ہے جو گاندھی جی نے ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس کی ایک تقریر میں دیا۔ انھوں نے کہا "کانگریس اصل میں سب سے بڑھ کر ان خاموش ہوکے انسانوں کی نمائندہ ہے جو کروڑوں کی تعداد میں اُن سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں جو برطانوی ہند اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں واقع ہیں۔ ہر مفاد کی صورت جو کانگریس کی نگاہ میں تحفظ کے لائق ہے ان کروڑوں خاموش انسانوں کے مفاد کے ماتحت ہوگی۔ اس لیے آپ لوگوں کو بہ ظاہر اکثر مفاد میں تصادم نظر آتا ہوگا اور مجھے کانگریس کی جانب سے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اگر حقیقتاً کوئی اہم تصادم ہوا تو کانگریس ان کروڑوں انسانوں کے لیے اپنے ہر مفاد کی قربانی کر دے گی۔"

کسانوں سے ہمارے روزانہ بڑھتے ہوئے تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم زیادہ سے زیادہ ان ہی کی اچھائی اور برائی کی روشنی میں سوچنے لگے۔ بردولی، صوبۂ متحدہ اور دوسری جگہوں پر کسان تحریکیں اٹھیں اکثر مقامی کانگریس کمیٹیوں کو اپنی خواہش کے خلاف مفاد کے اس اختلاف کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور اپنے دیہات کے ممبروں کو مشورہ دینا پڑتا تھا کہ انھیں کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ بعض صوبوں میں صوبائی کمیٹیوں نے یہی کیا۔

۱۹۲۹ء کی گرمیوں میں خود آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے بمبئی کے جلسے میں اس سوال کا کھل کر مقابلہ کیا اور ملک کو اصولی راستہ دکھایا۔ اس نے پورا قومی پس منظر سامنے رکھ کر اور سیاسی آزادی پر زور دے کر پوری قوت سے اس کا اعلان کیا کہ ملک کا موجودہ اقتصادی نظام ہمارے افلاس کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے تجویز کے الفاظ حسب ذیل تھے:

"اس کمیٹی کے خیال میں ہندوستانیوں کے ہولناک افلاس اور مصائب کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں بیرونی لوٹ مچی ہوئی ہے بلکہ سماج کا معاشی نظام بھی ہے جسے غیر ملکی

حکومت اس لیے مدد پہنچاتی ہے تاکہ اس کی لوٹ جاری رہ سکے اس لیے اس افلاس اور تکلیف کو دور کرنے اور ہندوستانی عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے موجودہ اقتصادی اور معاشرتی نظام میں انقلاب انگیز تبدیلی کرنا اور حیرت خیز عدم مساوات کو دور کرنا بے حد ضروری ہے۔"

"انقلاب انگیز تبدیلیاں!" ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب میں نے یہی الفاظ لکھنؤ میں استعمال کیے تو بہت سے لوگوں نے سوچا کہ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم کے لیے نئے ہیں۔ بہت تھوڑے سے سوشلسٹ بھی اس عام پالیسی اور نقطۂ نظر میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ پھر یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ کانگریس سوشلسٹ ہو گئی۔ یہ روز بروز ہندوستانیوں کی غربت اور تکلیف کا احساس کرتی جاتی تھی اور یہ خیال بڑھتا جاتا تھا کہ صرف سیاسی تغیرات کافی نہیں بلکہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ یہ "کچھ اور"، وہی "انقلاب انگیز تبدیلی" اور موجودہ اقتصادی اور معاشی نظام میں تغیر تھا یہ تبدیلی کیا ہوگی، کانگریس نے بیان نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اسے ناصاف اور مشکوک رہنا بھی چاہیے تھا۔

سول نافرمانی شروع ہوئی۔ یہ ایک سیاسی مقصد کے لیے سیاسی تحریک تھی۔ ہم نے پھر مفاد کے تصادم کو سامنے آتے دیکھا اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور دوسرے مفاد رکھنے والے کسی دور رس سیاسی تغیرات کے خوف سے اس تحریک کی مخالفت کرتے رہے اور برطانوی حکومت کی حمایت۔ صوبۂ متحدہ کی طرح کے بعض حصوں میں کسانوں کی تحریک کی وجہ سے یہ تصادم اور نمایاں تھا۔

کراچی میں اس اقتصادی تبدیلی کی جانب قدم اور تیز اٹھے۔ کانگریس بہت زیادہ آگے جانے سے ہچکچاتی تھی لیکن رک بھی نہ سکتی تھی اس نے پھر اعلان کیا کہ "عوام کی تاراجی" کا خاتمہ کرنے کے لیے سیاسی آزادی میں کروڑوں بھوکے انسانوں کی معاشی آزادی بھی شامل ہونا چاہیے۔" کانگریس نے مزدوری وغیرہ کے بارے میں بھی بات کرنا شروع کیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ "جمہوریت تمام بنیادی اور ضروری صنعتوں اور ملازمتوں، معدنیات، نہر اور دریا، جہازرانی اور دوسرے ذرائع آمد و رفت پر اپنا قبضہ رکھے گی۔" یہ ایک اشتراکی تجویز تھی لیکن پھر بھی سوشلزم سے بہت دور۔

اسی طرح کانگریس واقعات کی قوت اور حقیقت کے اثر سے اقتصادی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے بھی مجبور ہوئی۔ سیاسی آزادی کے لیے انتہائی جوش وخروش کے باوجود یہ اسے اقتصادی آزادی سے الگ نہ کر سکی دونوں ایک دوسرے سے نہ جدا ہونے والے انداز میں وابستہ ہیں۔ ہم نے انھیں علیحدہ رکھنے کی کوشش کی اور صرف سیاسی آزادی پر ساری توجہ رکھنی چاہی لیکن اقتصادی مسئلہ بھی اندر آنے پر ضد کرتا رہا۔ ہم نے ان تصادمات سے آنکھ بند کر لینا چاہا لیکن سیاسی افق پر بھی برابر یہ نمایاں ہوتے رہے۔ گول میز کانفرنس نے خود غرضی کے مفاد رکھنے والوں کو برطانیہ کے پیچھے پناہ لے کر ہندوستان کی آزادی چاہنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس طرح دیکھا کہ ایک الہامی منظر کی طرح سب کچھ روشن ہو گیا۔

حافظہ بہت ناپائدار ہوتا ہے اور بہت سے لوگ کانگریس اور ہندوستان کی اس ماضی قریب کی تاریخ کو بھول گئے۔ اشتراکیت اور سماج کے اقتصادی نظام میں تبدیلی یہ ایسے نئے خیالات نہیں ہیں کہ جنھیں کانگریس نے کبھی سنا ہی نہ ہو اور نہ مفاد کا تصادم کوئی نیا تصور ہے۔ پھر بھی یہ بالکل صحیح ہے کہ موجودہ کانگریس اشتراکی نہیں ہے۔ لیکن چاہے یہ اشتراکی ہو یا نہ ہو زبردستی ہوئے یہ ایک ایسا ادارہ نہیں رہا جو اقتصادی مسئلہ سے قطع نظر کر کے صرف سیاسی حیثیت سے غور کرے۔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ لکھ رہا ہوں اس کے خاص کاموں میں ایک کام یہ بھی ہے کہ کسانوں کی شکایات اور تکالیف کی تحقیقات کرکے اور اس سلسلہ میں کوئی پروگرام بنائے۔ یہ اور دوسرے معاشی مسائل کا مقابلہ کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ ایسا کرنے میں جہاں کہیں بھی مفاد کا تصادم ہوگا اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ہر اس مفاد کو جو عوام کے مفاد سے ٹکراتا ہے قربان کرنا پڑے گا۔

یہ بات صاف ہے کہ ہمیں اپنی پوری توجہ سیاسی مسئلہ یعنی ہندوستان کی آزادی پر لگا دینی چاہیے۔ یہ ہمارے لیے پہلی اساسی اہمیت رکھتا ہے ہر وہ عمل یا تصور جو اس مسئلے کو دھندلا بناتا ہے ناخوش گوار ہے اور اس کی ہمت افزائی نہ کرنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے پر کانگریس کے ہر طبقے میں اتفاق ہے۔ پھر سوشلزم کا تذکرہ ہی کیوں ہے؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اس لیے نہیں ہے کہ کوئی اشتراکی خیال کرتا ہے کہ ہندوستان کی

آزادی قائم ہونے کے پہلے ہی سوشلزم کے لیے کوئی جگہ نکل سکے گی۔ یہ صرف آزادی کے بعد ہی آسکتی ہے اور وہ بھی اس وقت جب ہندوستان کی حالت اس کے لیے موزوں ہو اور یہاں کی اکثریت اس کے لیے تیار ہو۔ لیکن اشتراکی نقطۂ نظر سیاسی جدوجہد میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ سیاسی مسئلہ اس سے واضح ہو جاتا ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ آزادی کا صحیح سیاسی مفہوم (معاشرتی مفہوم کے علاوہ) کیا ہونا چاہیے۔ خود آزادی کی تعبیریں مختلف طرح کی گئی ہیں لیکن ایک اشتراکی کے لیے اس کا صرف ایک مفہوم ہے اور وہ مفہوم سامراج شاہی سے ہر طرح کے تعلق سے اظہارِ بیزاری کرنا ہے۔ اس لیے ہماری سیاسی قوت کے سامراج دشمن رخ کو اہمیت دی جاتی ہے اس طرح ہمیں اپنے دوسرے کاموں کو ناپنے کے لیے ایک پیمانہ ہاتھ آجاتا ہے۔

علاوہ بریں اشتراکی نقطۂ نظر اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہمیں عوام کو اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور ہماری جدوجہد کو عوام ہی کی جدوجہد ہونا چاہیے (کانگریس نے بھی گزشتہ پندرہ سال میں مختلف صورتوں سے اسی پر زور دیا ہے) آزادی کا مقصد عوام کی تباہی و بربادی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

یہ بحث ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے پر متوجہ کرتی ہے کہ کس قسم کا "سوراج" ہمارا نصب العین ہے۔ قابلِ قدر اصرار کے ساتھ ڈاکٹر بھگوان داس کئی برس سے یہ مطالبہ رہا ہے کہ سوراج کی تعریف ہو جانی چاہیے۔ میں ان کے بعض خیالات میں ان سے متفق نہیں لیکن اس میں متفق ہوں کہ ہم چاہے کتنا ہی غیر معین طریقے پر سہی مگر بغیر یہ ظاہر کیے ہوئے کہ ہم کس قسم کا سوراج چاہتے ہیں سوراج کے بارے میں برابر گفتگو نہیں کر سکتے۔ کیا ملک کی حکومت میں موجودہ دور کے سرمایہ دار اور دوسرے مفاد رکھنے والے برطانویوں کے جانشین بن جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ کانگریس کی یہ پالیسی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم بارہا اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم انسانوں کی لوٹ اور تباہی کے خلاف ہیں۔ اس لیے یہ لازم آتا ہے کہ ہم عوام کی تقویت کو اپنا مقصد بنا لیں تاکہ ہندوستان سے شہنشاہیت کے رخصت ہونے پر حقیقتاً کچھ قوت ان کے ہاتھ میں ہو۔

عوام کی یہ تقویت اور اس کے ذریعے سے کانگریس کی مضبوطی صرف اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ یہ ہمارا عین مقصد ہے بلکہ خود قوت کے لحاظ سے بھی ضروری ہے۔ صرف عوام اس جدوجہد کو

سچی قوت پہنچا سکتے ہیں، صرف وہ اس سیاسی لڑائی کو ختم تک لڑ سکتے ہیں۔

اس طرح اشتراکی نقطۂ نظر ہماری موجودہ جنگ میں ہماری مدد کرتا ہے۔ یہ اس وقت صرف ایک بے کار، دور دراز اور مشتبہ مستقبل کے متعلق علمی مباحثہ کا دروازہ کھولنے کا سوال نہیں ہے بلکہ اپنی سیاسی پالیسی کو اس طرح کے سانچے میں ڈھالنے کا سوال ہے جو اسے اور زیادہ موثر اور طاقت ور بنا سکے۔ یہ سوشلزم نہیں بلکہ سامراج دشمنی ہے۔ یہ وہ سیاسی پہلو ہے جو اشتراکی نقطۂ نظر سے دکھائی دیتا ہے۔

بے شک سوشلزم اس سے آگے بھی دیکھتا ہے۔ اس کا مقصد ہوتا ہے نئے سرے سماجی نظام کی تشکیل۔ ایسی تشکیل جس کی بنیاد نفع اٹھانے کے جذبات کی نفی پر ہو۔ فی الحال یہ ممکن نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس پر دھیان دینا ہی محض علمی اور نا وقت بات معلوم ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ خیال تنگ نظری پر مبنی ہوگا کیونکہ اصل مقصد پر غور و خوض اور اس کی صفائی، چاہے ہم اسے طے نہ کر سکیں، مقصد کے حاصل کرنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جب سیاسی آزادی حاصل ہو گی تو طاقت کس کے ہاتھوں میں جائے گی؟ کیونکہ معاشرتی تبدیلیاں اسی پر منحصر ہوں گی اور اگر ہم معاشرتی تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو لوگ تبدیلیاں چاہتے ہیں ان کے ہاتھ میں تبدیل کرنے کی قوت بھی ہو۔ اگر یہ ہمارا نصب العین نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ساری جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کو ان سرمایہ داروں اور خود غرضی کے مفاد رکھنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے جو کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔

اشتراکی ان سوالات کے حل کے لیے مارکسیت MARXISM کا استعمال کرتا ہے۔ یہ گزشتہ اور موجودہ تاریخ پر نظر ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ آج کوئی مارکس کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا لیکن اسے بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے واقعات کی صحیح ترجمانی، جس نے تاریخ کی طویل اور پیچیدہ راہ روشن کر دی کوئی اتفاقی یا تیز تبدیلی نہیں تھی، اس کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں تھیں، یونانیوں، رومیوں اور نشاۃ ثانیہ اور مابعد کے یوروپین مفکرین کو بھی اس کا علم تھا۔ وہ تاریخ کو ایک تحریک اور خیالات اور مفاد کے تصادم کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مارکس نے اس قدیم فلسفے کو سائنس کی روشنی میں دیکھا، اسے پھیلایا اور اسے اس حسن سے ظاہر کیا

کہ ساری دنیا متاثر ہوگئی ۔ اس اظہار میں کہیں کہیں کوئی بات چھوٹی ہوئی بھی ہوسکتی ہے اور کسی کسی جگہ ضرورت سے زیادہ اہمیت بھی دیا جانا ممکن ہے ۔ ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ہم اُسے چند عقائد کی طرح دیکھیں بلکہ اس لحاظ سے دیکھنا چاہیے کہ تاریخ اور سماجی تغیرات پر نظر ڈالنے کا ایک حکیمانہ طریقہ ہے ۔ اس پر بہت شور کیا جاتا ہے کہ مارکس نے زندگی کے صرف اقتصادی پہلو پر زور دیا ۔ اس نے اس پر اس لیے زور دیا کہ یہ اہم بھی ہے اور اسے نظر انداز کرنے کا ایک عام رجحان پیدا ہوگیا تھا لیکن اس نے کبھی ان دوسری طاقتوں کو نظر انداز نہیں کیا جو انسانوں پر اثر ڈالتی ہیں اور واقعات کو ترتیب دیتی ہیں ۔

مارکس ایسا نام ہے جو بہت سے ایسے لوگوں کو خوف زدہ کر دیتا ہے جو اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ۔ ایسے لوگوں کو شاید یہ بات سن کر دلچسپی ہوگی جو ابھی کچھ دن پہلے برطانیہ کے ایک ایسے معزز اور باوقار لبرل نے کہی جسے کسی طرح اس معاملے میں سرگرمی لینے والا نہیں کہہ سکتے ۔ جون ۱۹۳۱ء میں لارڈ لوتھین نے لندن اسکول آف اکنامکس کے سالانہ جلسے کے موقع پر کہا:

"کیا موجودہ سماج کی خرابیوں کی جو تشخیص مارکس نے کی ہے اس میں اس سے زیادہ سچائی نہیں ہے جتنی ہم خیال کرتے ہیں ؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مارکس اور لینن کی پیشین گوئیاں نہایت تکلیف دہ صحت کے ساتھ پوری ہوتی جا رہی ہیں ۔ جب ہم مغربی دنیا کی موجودہ حالت پر نظر کرتے ہیں اور اس کے مصائب کے سلسلے کا جاری رہنا دیکھتے ہیں تو کیا یہ بات بالکل صاف ظاہر نہیں ہو جاتی کہ ہمیں بنیادی اسباب و علل پر اس سے بہت زیادہ گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے ہم آج تک دیکھنے کے عادی رہے ہیں ؟ اور میرا خیال ہے کہ جب ہم ایسا کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مارکس کی تشخیص کا زیادہ حصہ بالکل صحیح ہے ۔"

ایک ایسے شخص کا اعتراف جو آسانی سے ہندوستان کا وائسرائے بن سکتا ہے اہمیت رکھتا ہے ۔ اپنے طبقے کے تمام تعصبات اور ماحول کے پر زور دباؤ کے باوجود ان کی حساس ذہانت مارکس کی تجویز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ ممکن ہے کہ لارڈ لوتھین نے گزشتہ پانچ سال میں اپنی رائے بدل دی ہو میں نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۳۱ء کی کہی ہوئی بات ان کے موجودہ خیالات کی کتنی ترجمانی کرتی ہے ۔

لیکن اس کانگریس کے سامنے مارکس کے نظریے کا سوال نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ آیا ہمیں اُن بڑے نتائج سے لڑنا چاہیے جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں یا اُن اسباب کی گفتگو کرنا چاہیے جو اُن نتائج کی تہہ میں ہیں۔ وہ لوگ جو صرف نتائج پر غور کرتے ہیں مشکل ہی سے دور تک جا سکتے ہیں۔" انھیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ نتائج سے برسرِ پیکار ہیں اُن نتائج کے اسباب سے نہیں وہ لوگ پستی کی طرف جانے والی تحریک کی چال کو دھیمی کر رہے ہیں لیکن اس کا راستہ بدل نہیں رہے ہیں۔ وہ مرض کا علاج نہیں کر رہے ہیں بلکہ وقتی طور پر درد کو گھٹانے والی دوائیں استعمال کر رہے ہیں"۔

اسباب ہوں یا اثرات۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔ اگر ہم اسباب کی جستجو کریں جیسا کہ ہمیں کرنا ہی چاہیے تو اشتراکی تجزیہ ان پر بڑی روشنی ڈالتا ہے اور اس طرح اگرچہ اشتراکی حکومت مستقبل بعید کا ایک خواب ہی کیوں نہ ہو جسے ہم میں سے بہت سے لوگ شاید دیکھنے کو زندہ بھی نہ رہیں تاہم سوشلزم موجودہ دور کی راستہ بتانے والی روشنی ہے جو اس راستے کو روشن کرتی ہے جس پر ہمیں چلنا ہے۔

اشتراکیوں کا یہی خیال ہے۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سے دوسرے لوگ جو اس جدوجہد میں ان کے رفیقِ کار ہیں اس طرح نہیں سوچتے جیسا کہ کچھ لوگ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کر سکتے کہ وہ ایک بلند عالمانہ حیثیت اختیار کر لیں اور اپنی علیحدہ ایک ٹولی بنا لیں۔ انھیں دوسرے طریقوں سے اپنے کو حق بجانب دکھانا پڑتا ہے اور اس طرح انھیں دوسرے ساتھیوں اور سارے ملک کو اپنے نقطۂ خیال تک لانے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ بات یہ ہے کہ چاہے ہم سوشلزم کے معاملے میں متحد ہوں یا اختلاف رکھتے ہوں ہم آزادی کی منزل کی جانب ایک ساتھ قدم بڑھاتے ہیں

۱۰ر جولائی ۱۹۳۶ء

---

# پیامات - انتخاب کے موقع پر

(بہار)

کمان سے چھوٹتے ہوئے تیر کی طرح میں سات دن تک بہار میں پھرتا رہا اور جہاں کہیں بھی گیا کانگریس کا پیام لے گیا۔ اس ایک ہفتے میں میں نے اس صوبے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے جاکر نیپال کی سرحد تک سفر کیا۔ گاؤں میں مجھے افلاس کے مارے ہوئے دیہاتیوں کے بڑے بڑے مجمعوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، میں ان مشہور شہروں سے ہوکر گزرا جو تاریخ اور روایات میں مشہور رہیں اور ان نئے شہروں سے بھی جہاں صنعتی کارخانے اور تجارت بے کاری اور ریلوے کی ہڑتالیں ہیں۔ میں نے اس لوہے کے شہر جمشید پور اور کوئلے کے سیاہ علاقے کو بھی عبور کیا۔ میں بڑی تیزی سے چھوٹا ناگپور سے بھی گزر گیا جو اپنے خوبصورت جنگلوں اور غیر متمدن ابتدائی انسانوں کے لیے مشہور ہے۔ ہر مقام پر میں نے کانگریس کے پیام کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے لوگوں کو پایا، ہر قدم پر لامحدود خلوص اور محبت کا اظہار دیکھا۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ اس صوبے سے رخصت ہو رہا ہوں لیکن میں اپنے ساتھ یہاں کے لوگوں کی فیاضانہ محبت کی فرحت بخش یاد لیے جاتا ہوں۔ آئندہ کی سرگرمیوں اور خطروں میں مجھے اس سے قوت اور تازگی حاصل ہوگی۔ بہار کے مرد اور عورتو! ایک عظیم الشان اور اہم مہم کے عزیز رفیقو میں تمھارے لیے خوش بختی، ہمت اور استقلال کی دعا کرتا ہوں۔

جنوری ۱۹۳۷ء

# صوبۂ متحدہ

(۱)

میں نے صوبۂ متحدہ کے اضلاع کا دورہ ختم کرلیا ہے اور اب دکن کی جانب مہاراشٹر اور کرناٹک جا رہا ہوں میں قریب قریب اس صوبے کے کل اڑتالیس اضلاع میں گزشتہ مہینوں اور ہفتوں میں گیا اور اپنے اہلِ وطن کا حیرت خیز جوش دیکھنے کے بعد مسرت اور اعتماد کے ساتھ واپس ہوا ہوں۔ کانگریس کا نام شہر اور دیہات میں یکساں طور پر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ یہ ہمارے کروڑوں انسانوں کے لیے امید اور پناہ کا گھر بن گیا ہے۔ اب ہمارے حاکموں اور فائدہ اٹھانے والوں کی فوجی قوتیں بھی ان کروڑوں انسانوں کو دبا کر نہیں رکھ سکتیں وہ طویل راتوں سے تھک چکے ہیں، انھیں نسیم سحر کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اس لیے کانگریس کے ہمت آفریں اور پناہ گزیں جھنڈے کے سایہ میں ہم فتح کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں انتخابات کا مقابلہ کرنا ہے۔ کل اور پرسوں ووٹ دینے والے اُن جگہوں پر جائیں گے جہاں ووٹ دیے جاتے ہیں۔ ہر مرد اور عورت رائے دینے والے کے لیے فرض ہے کہ وہ ملک کا حق ادا کرے اور کانگریس کو ووٹ دے۔ اس طرح ہم لاکھوں ہاتھوں سے آزادی کا شعلہ فشاں عہد لکھیں گے۔

۶ر فروری ۱۹۳۷ء

(۲)

صوبۂ متحدہ کے رفیقو! میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دور دراز کرناٹک سے آپ کی فتح میں شریک ہوں۔ جیساکہ ہمارا خیال تھا ہم نے چناؤ میں بڑی زبردست فتح حاصل کی۔ لیکن یہ جیت ہے کس کی؟ یقیناً یہ جیت انفرادی اور ذاتی حیثیت میں ہمارے امیدواروں کی نہیں ہے اور نہ کانگریس کے ان سپاہیوں اور کام کرنے والوں کی ہے جنھوں نے اس کامیابی کے لیے محنت و مشقت کی۔ یہ فتح کانگریس کی ہے۔ وہ کانگریس جس نے ہمیں پالا ہے اور ہمارے لاکھوں بھائیوں کے دلوں میں امید کی آگ روشن ہے۔ بلکہ اس بڑھ کر یہ ہے

کہ فاتح خود وہ عوام ہیں جنھوں نے ہر طرح کے دباؤ، دھمکی، ظلم اور ترغیب کے باوجود فتح حاصل کی ہے۔ ہمارے دیہاتی رائے دہندوں کا باقاعدہ جلوس کی شکل میں لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے قومی جھنڈا لیے ہوئے پولنگ اسٹیشن تک جانا اور متفقہ طور پر کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دینا ہر حیثیت سے ایک دل کش اور ہمت افزا منظر تھا۔

انھوں نے ہماری آواز پر کان دیا اور کانگریس کے پیام کو سن کر بڑی شان سے لبیک کہا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح صوبۂ متحدہ بھی نئے قانون کو مکمل طور پر رد کرنے اس کے خاتمہ کے لیے لڑنے اور کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی (سارے ملک کی قانون ساز جماعت جو ملک کا دستورِ اساسی بنائے گی) کی بنیاد پر نئے سرے سے قانون بنانے کے لیے آمادہ اور مستعد ہے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ صحیح ہے کہ عوام نے کانگریس کو ووٹ دیے کیونکہ انھوں نے یہ بات محسوس کی کہ کانگریس ان کے مفاد کے لیے ہے، اُن کی خدمت گزار ہے اور ان کی صحیح نمائندہ ہے ہمیں اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور عوام کے لنگر سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے۔ یہی چیز آخر میں ہماری کامیابی کا سبب بنے گی اور ہمارے وہ وعدے جو ہم نے اپنے بھائیوں سے کیے ہیں اس طرح وفا ہوں گے۔ کوئی دوسرا قدام اپنے مقصد سے اور عوام کی ان امیدوں سے جو ہم نے لاکھوں دلوں میں پیدا کر دی ہیں، غدّاری کے برابر ہوگا۔ یوپی، بہار اور دوسری جگہوں سے اس انتخاب میں ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی براہِ راست عوام کے پاس گئے ہیں اور اس صاف اور سادہ زبان میں بات چیت کی ہے جسے وہ سمجھتے ہیں، انھوں نے خوشی اور دل سے اپنی تمام قوت ہماری تائید میں صرف کر دی۔ جہاں ہم نے کمزوری دکھائی اور سمجھوتے کی بات چیت کرنے لگے وہاں ہماری فتح مکمل نہیں ہوئی۔ ہمارے بہترین اور سب سے زیادہ مضبوط امیدوار کانگریس کے وہ کام کرنے والے تھے جو ذاتی ذرائع اور اثرات نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ہمیں اس فتح مندی پر مغرور نہ ہونا چاہیے بلکہ محسوس کرنا چاہیے کہ اس کا سہرا عوام کے سر ہے۔ یوپی، بہار اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے بسنے والوں نے ہندوستان کی برطانوی شہنشاہیت کو ملک چھوڑنے کی اطلاع دے دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بمبئی، گجرات، مہاراشٹرا اور کرناٹک بھی اسی پر عمل پیرا ہوں گے اور یہی اطلاع پوری

قوت کے ساتھ دیں گے۔ سامراج شاہی کے دن گنے ہوئے ہیں، قوم نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل کریں اور عوام سے اپنا رشتہ اور مضبوط کریں۔ انتخاب تو جلد ہی ختم ہو جائے گا لیکن جس کام کا عہد ہم نے کیا ہے وہ باقی رہے گا ہمیں اس کام کے لیے اپنے تئیں تیار کرنا ہے۔ کامل اعتماد کے ساتھ ہم اس آخری فتح کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔

۱۲، فروری ۱۹۳۷ء

## جنوبی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں سے

میں اپنے طولانی سفر کے بعد اب شمال کو واپس جا رہا ہوں ہیں تاکہ سوراج کی طویل تر جاترا کی تیاری کروں جس کے مقابلے میں یہ سفر ایک قدم کے برابر ہے۔ میں کانگریس کا پیغام جنوب اور مغرب میں لے گیا لیکن اب آپ نے اس پیغام کو صرف میری کمزور آواز میں نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کے کروڑوں انسانوں سے سنا ہے جو کانگریس کی آواز پر جمع ہو گئے اور جن کی آزادی کے لیے گرجتی ہوئی صدا ہندوستان کی وادیوں اور چوڑے میدانوں میں گونج رہی ہے۔ آپ کے دلوں میں اس آواز کی بازگشت کس شکل میں نمایاں ہوتی ہے؟ کیا عوام کی اس ہمت افزا چیخ پر آپ کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے نہیں لگتا؟ ہندوستان آپ کے دلیر جواب کا منتظر ہے اور جاننا ہے کہ وہ جواب کیا ہوگا۔ رجعت پسندی اور آزادی کے دشمنوں سے بچیے اور کانگریس کے ساتھ ہو جائیے۔ ایک ہی قطار میں ہو کر ہمیں ساتھ ساتھ سوراج کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اس آواز کو ان سنی کرنے کی ہمت کس میں ہے؟۔

فروری ۱۹۳۷ء

---

# کانگریس اور مسلمان

(۱)

مسٹر جناح نے حال ہی میں تقریر کرتے ہوئے میرے اس خیال پر کہ حقیقتاً ہندوستان میں گورنمنٹ اور کانگریس صرف دو ہی فریق ہیں، اعتراض کیا ہے اور مجھے یاد دلایا ہے کہ ایک تیسری جماعت بھی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اپنی اس تقریر کے دوران میں انھوں نے بعض غور طلب باتیں کہی ہیں۔ میں بہار میں ہوں اور دوڑ دھوپ میں مصروف ہوں، اس لیے مجھے وقت نہ مل سکا کہ میں مسٹر جناح کی تقریر پر اتنا غور کرتا جس کی وہ مستحق ہے لیکن جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کی اہمیت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ایک تھکا دینے والے پروگرام اور دن بھر کی بھاری محنت کے بعد بھی کچھ وقت نکالوں اور چند جملے پیش کروں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر جناح نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جو فرقہ پرستی کو انتہا تک پہنچاتی ہے۔ انھیں بنگالی مسلمانوں کے مسائل میں کانگریس کی مداخلت پر اعتراض ہے اور وہ کانگریس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دے۔ یہ اعتراض اور یہ مطالبہ بھائی پرمانند کی ان باتوں سے ایک طرح کی خاندانی مشابہت رکھتا ہے جو انھوں نے ہندو فرقہ پرستوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً کہی ہیں۔ اگر منطقی نتیجہ نکالا جائے تو مسٹر جناح کے بیان کا مطلب یہ ہوا کہ جمہور کے معاملات میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے افعال سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں مسلمانوں کو ایک علیحدہ طبقے کی طرح الگ کام کرنا چاہیے اور دوسرے فرقوں سے اس طرح معاملت رکھنا چاہیے جیسے ایک قوم دوسرے سے رکھتی ہے یہی صورت تجارتی انجمنوں، کسانوں کی انجمن، کاروبار، چیمبر آف کامرس اور اس طرح کے دوسرے

اداروں میں بھی ہونی چاہیے۔ ہندوستان میں مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور جو اس حقیقت کو بھول جاتا ہے وہ روح القدس کا گنہگار ہوتا ہے اور مسٹر جناح کو ناراض کرتا ہے۔

اچھا سوال یہ ہے کہ مسلمان کون ہیں؟ بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہی لوگ مسلمان ہیں جو مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی پیروی کرتے ہیں مسٹر جناح ہمیں بتاتے ہیں کہ جب مولانا محمد علی نے کانگریس میں شرکت اختیار کی تو انھوں نے گویا مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی کہ اس وقت ہزارہا مسلمان کانگریس کے ممبر تھے اور اس کے ہمدرد و مددگار تھے۔ مسلم لیگ کے باہر ہونے اور مسٹر جناح کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے وہ غیر مسلم سمجھے جا سکتے ہیں۔ غالباً مسٹر جناح کے خیال کے مطابق بنگال اور پنجاب کے کسان اور احرار مسلم لیگ کے حلقے سے باہر ہونے کی وجہ سے دراصل مسلمان نہیں ہیں۔ اب ہمیں مذہبیت کے جانچنے کی ایک نئی کسوٹی ہاتھ آگئی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر جناح ان بے شمار مسلمانوں کے بارے میں ہم کانگریسیوں سے کیا چاہیں گے جو کانگریس میں شریک ہیں۔ کیا وہ ہم سے یہ امید کریں گے کہ ہم ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کریں اور باادب انداز میں ان کے پاس بھیج دیں؟ اور میں ان کسانوں اور دیہاتی مسلمانوں کے مجمع سے کیا کہوں جو میری بات سننے کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔

مجھے یہ اصول بہت عجیب نقصان دہ اور مسلمانوں کے حق میں ناانصافی پر مبنی معلوم ہوتا ہے ان کا ایک "تیسری جماعت" کی طرف اشارہ بھی مسلمانوں کے لیے کچھ زیادہ خوش کن یا قابلِ تعریف نہیں ہے۔ برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کے درمیان میں وہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں بہ ظاہر اس کا یہی مقصد معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے خلاف آلۂ کار کے طور پر استعمال کرسکیں اور جمہور کے مفاد کو فرقہ وارانہ مفاد پر بھینٹ چڑھا دیں۔

میں ایسے یا اسی طرح کے کسی اور فرقہ وارانہ طریقے پر بالکل سوچ ہی نہیں سکتا اور مسٹر جناح سے ہر طرح کی معذرت کے بعد کیب اشارتاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے خیالات ازمنۂ وسطیٰ کے ہیں اور اب ان کا وقت نہیں رہا۔ ان کا کوئی تعلق عصرِ حاضر کے حالات اور موجودہ دور کے مسائل سے نہیں کیونکہ یہ خالصتاً سیاسی اور اقتصادی ہیں۔ مذہب ایک ذاتی اور شخصی معاملہ ہونے کے علاوہ اعتقاد کی چیز ہے لیکن سیاسی اور معاشی مسائل میں مذہب پر زور دینا اندھیرے میں جانا ہے جہاں اصل مسائل سے ہٹنے کی صورت پیدا ہوتی ہے مسلمان کسان

کا مفاد کس طرح ہندو کسان کے مفاد سے مختلف ہے ؟ یا کس طرح مسلمان مزدور کاریگر، تاجر، زمین دار یا مل کے مالک کا مفاد ایسے ہی ہندوؤں کے مقابلے میں الگ ہے، جو رشتے لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں وہ ان کے اقتصادی مفاد اور اگر ملک محکوم ہوا تو قومی مفاد ہوتے ہیں۔ مذہبی سوالات اٹھ سکتے ہیں اور مذہبی جھگڑے کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن ان کا مقابلہ کر کے تصفیہ کرنا چاہیے۔ ان کو سلجھانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کے عمل اور اثر کو محدود کر دیا جائے اور انھیں سیاست اور معاشیات میں دخل انداز ہونے سے روکا جائے۔ فرقہ وارانہ باتوں سے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو ہوا دینا رجعت پسندی کی ہمت افزائی اور دور وسطیٰ میں پلٹ جانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی کیونکہ حقائق کو نظر انداز کرتی ہے۔

آج کی حقیقتیں افلاس اور بھوک، بے کاری اور برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کا تصادم ہیں۔ فرقہ وارانہ انداز میں ان پر کس طرح غور کیا جا سکتا ہے ؟۔

اس میں شک نہیں کہ آج کل ملک میں بہت سی پارٹیاں جماعتیں اور پرانے خیال کے افراد ہیں۔ لیکن تاریخی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اصل مقابلہ شہنشاہیت اور قومیت میں ہے۔ کوئی "تیسری جماعت" اور درمیانی یا غیر معین گروہ تاریخی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی کوئی مستقل قوت نہیں ہوتی۔ ایسی جماعتیں الیکشن اور اسی طرح کے دوسرے موقعوں پر سرگرم کار ہوتی ہیں اور دوسرے اوقات میں دب جاتی ہیں۔ کانگریس ہندوستانی قومیت کی نمائندگی کرتی ہے اس لیے وہ ایک تاریخی مستقبل کی ذمہ دار ہے۔ اسی سبب سے یہی تنہا ادارہ ہے جس نے ہندوستان میں بڑا وقار پیدا کر لیا ہے اور وہ قوت اور ارادہ اکٹھا کیا ہے جو برطانوی سامراج سے مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے اس طرح تجزیہ کرنے کے بعد یہی حاصل ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت صرف دو قوتیں ہیں اور وہ برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کی نمائندہ کانگریس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ ملک میں اور دوسری اہم قوتیں بھی ہیں جو ایک نیا سماجی نقطہ نظر پیش کرتی ہیں لیکن وہ کانگریس سے مس ہوئی ہیں۔ فرقہ وارانہ جتھہ بندیوں میں اس طرح کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگرچہ کبھی کبھی اہمیت ان کے سر تھوپی جاتی ہے۔

مسٹر جناح لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک پارٹی کے لیڈر رہیں اس پارٹی کے ممبروں نے اپنی پارٹی سے

اور ایک دوسرے سے حیرت خیز بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ بات یہ ہے کہ کوئی مشترک اصول یا پالیسی انھیں آپس میں وابستہ نہیں کیے ہوئے ہے اور جب کسی حقیقی مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی نتیجہ مذہبی جماعتوں کا ہونا لازمی ہے۔

یہاں مطلق العنان رہنماؤں (ڈکٹیٹروں) اور ناسمجھ مقلدوں کا سوال نہیں ہے۔ کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے جس کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں گہری جاتی ہیں۔ اس کا دروازہ ہر اس ہندوستانی کے لیے کھلا ہوا ہے جو آزادی پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اس کے لیے سب سے مقدم مسئلہ ایسی آزادی ہے جو مفلسی اور دوسروں کی لوٹ مار سے نجات دلائے۔ کانگریس سے غلطیاں ہو سکتی ہیں لیکن یہ ہمیشہ قومیت اور قومی آزادی کی اصطلاح میں سوچتی ہے اور محدود یا فرقہ وارانہ انداز خیال سے بچنے کی کوشش کرتی ہے۔

مسلم لیگ کا کیا نصب العین ہے؟ کیا اس کا مقصد ہندوستان کی آزادی اور سامراج دشمنی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت کی نمائندگی ضرور کرتی ہے جو قابلِ عزت ہیں لیکن جن کا دائرۂ عمل متوسط طبقے کا اوپری حصہ ہے، جو مسلمان عوام سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے اور متوسط طبقہ کے نچلے حصّے سے بھی بہت کم سابقہ رکھتے ہیں، کیا میں مسٹر جناح سے اشارتاً بتا سکتا ہوں کہ میں مسلم لیگ کے بہت سے ممبروں سے کہیں زیادہ مسلم عوام سے قریب تر ہوں؟ میں ان کی بھوک اور غریبی کے بارے میں ان لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں جو تناسب فیصدی کا نسل کی نشستوں اور حکومت کی ملازمتوں کی بات کیا کرتے ہیں۔ پنجاب اور دوسرے مقامات پر میرے سامنے مسلمانوں کے بہت بڑے مجمعے رہے ہیں انھوں نے مجھ سے کبھی فرقہ وارانہ مسائل تناسب فیصدی یا جداگانہ انتخاب کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ ان کی ساری دلچسپی لگان اور مالگزاری قرض، آب پاشی کے محصول بے کاری اور اسی طرح کے دوسرے بوجھوں سے متعلق تھی جو وہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

کانگریس کے صدر کی حیثیت سے میں اس بات کا اعزاز اور حق رکھتا ہوں کہ میں سارے ملک کے ان لاتعداد مسلمانوں کی نمائندگی کروں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں بڑی بے جگری سے حصّہ لیا، جنھوں نے آزادی کے لیے مصیبتیں اٹھائیں اور کانگریس کے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر دوسروں کے دوش بہ دوش ہماری تاریخی جنگ میں شریک ہوتے۔ میں ان بہادر مسلمانوں کی

نمائندگی کرتا ہوں جو آج بھی ہماری فوجوں کی پہلی صف میں کھڑے ہیں اور جنھوں نے گزشتہ سالوں کی تکلیف اور مشقت میں بھی کانگریس کے ساتھ ثابت قدمی دکھائی ہے، میں عوام کی بھوک اور غریبی کی نمائندگی کرتا ہوں چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ روٹی، زمین، کام اور سیکڑوں پیس ڈالنے والے بوجھوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مطالبہ، ناقابل برداشت مظالم سے آزادی حاصل کرنے کی تڑپ میں ان سب کا نمائندہ ہوں کیونکہ کانگریس انھیں کے لیے ہے اور کانگریس نے مجھے ان اصولوں کو بلند کرنے اور اس مشعل کو اونچا کرنے کا ذمہ دار بنایا ہے جسے اس نے ہمارے ملک کے تاریک گوشوں کو روشن کرنے اور اپنے بھائیوں کے مصیبت زدہ دلوں میں امید، قوت اور چمک پیدا کرنے کے لیے جلایا ہے۔

کانگریس ہر طرح کے اتحادِ عمل کا استقبال کرتی ہے اس نے ہمیشہ سامراج شاہی کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ بنانے پر زور دیا ہے۔ وہ نہایت خوشی سے مسلم لیگ اور دوسرے اداروں سے اتحادِ عمل کرے گی لیکن اس اتحاد کی بنیاد سامراج دشمنی اور عوام کی بہبودی پر رکھی جا سکتی ہے۔ کانگریس کے خیال میں اونچے طبقے کے مٹھی بھر لوگوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ جو عوام کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دے کوئی پائیدار یا حقیقی قیمت نہیں رکھتا۔ کانگریس عوام سے سودا کرتی ہے کیونکہ در اصل وہ انھیں کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ عوام خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان فرقہ وارانہ مسائل کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں۔ وہ پوری قوت اور استقلال کے ساتھ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں معاشی اطمینان حاصل ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب سیاسی آزادی مل جائے۔ اس وسیع بنیاد پر ملک کے ان تمام عناصر کا پورا پورا اتحادِ عمل ہو سکتا ہے جو عوام کا بھلا چاہتے ہیں اور اپنے لیے سامراج شاہی سے چھٹکارا۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۷ء

---

(۲)

کانگریس میں مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے مسئلہ پر حال میں بہت کچھ توجہ دی گئی ہے

ان ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو کانگریس میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس پر غور کیا ہے اور ان لوگوں نے بھی جو گو کہ کانگریس کے ہمدرد ہیں لیکن اس میں شریک ہوتے ہوئے ہچکچاتے ہیں اس بات پر توجہ کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ مسلم عوام لازمی طور پر رفتہ رفتہ ان مشترکہ مصیبتوں اور اقتصادی مسئلوں پر جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں ہیں غور کرنے لگے ہیں۔ ان نئی تحریکوں کا ردّ عمل کرنے کے لیے چند برگزیدہ مسلمانوں نے عام مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ ان سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس کے نتائج سخت خطرناک ہوں گے اور اندیشہ ہے کہ سنگین سانحات رونما ہوں۔ مجھے ان مباحثوں میں حصہ لینے کا کوئی شوق نہیں کیونکہ ان میں فریقین رفتہ رفتہ ذاتیات پر اتر آتے ہیں اور غیر متعلق باتوں پر اکثر بحث چھڑ جاتی ہے۔ لہٰذا میں جو کچھ لکھ رہا ہوں یہ کسی مباحثہ چھیڑنے کے ارادہ سے نہیں بلکہ اس نیت سے کہ خیالات میں کوئی ابہام باقی نہ رہے اور کانگریس کا نقطۂ نظر لوگ بخوبی اور صاف سمجھ سکیں میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ کبھی کبھی کانگریس والے بھی اس کو صحیح طور پر سمجھنے میں قاصر رہتے ہیں اور مسلمانوں یا دیگر مذہبی جماعتوں سے معاہدہ یا صلح کرنے کی گفتگو کرتے ہیں۔

کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے جو لازمی طور پر اقتصادی مسائل بھی طے کرنا چاہتی ہے کیونکہ ان مسائل کا (اور دیگر مسائل کے مقابلے میں) عوام کی زندگی سے کہیں زیادہ گہرا تعلق ہے۔ کانگریس کا مقصد سیاسی خود مختاری ہے یعنی ہندوستانی عوام کا بلا قید مذہب طاقت حاصل کرنا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں بسنے والوں میں سے ہر فرد اس طاقت میں اپنا حصہ پائے گا کیونکہ جس نئے نظام کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں اس میں اس کا بہرہ مند ہونا لازمی ہے۔ ہماری مصیبت، ناداری اور بے روزگاری کے دور کرنے کا دارو مدار اسی نئے نظام پر ہے۔ غلامی اور مفلوک الحالی تو ہندوستانیوں کی مشترک قسمت ہے چاہے ان کا مذہب کچھ بھی ہو۔ لہٰذا آزادی اقتصادی ترقی اور معاشرتی بہبودی بھی سب کے لیے یکساں نعمت ثابت ہوگی انھیں چیزوں کو حاصل کرنے کے جہد کے لیے کانگریس ایک محاذ عام پیش کرتی ہے کیونکہ یہ ہمیشہ عوام کی بہبودی پر نظر رکھتی ہے ان کا دکھ درد سنتی ہے۔ ان کو منظم

کرتی ہے۔ ان کو صلاح دیتی ہے ان کی رہنمائی کرتی ہے اور انھیں سے طاقت حاصل کرتی ہے۔

کانگریس چونکہ ایک سیاسی انجمن ہے لہٰذا مذہبی معاملات سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی لیکن چونکہ مذہب اور معاشرت اکثر افراد کی زندگی کے اہم جزو ہیں اس لیے ان لوگوں کا کانگریس کا نقطۂ نظر جاننے کی خواہش کرنا جائز اور مناسب ہے۔ اسی کو محسوس کرتے ہوئے کانگریس نے کراچی میں اور نیز اس کے بعد صاف صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہر ہندوستانی کے بنیادی حقوق کا یہ لازمی جزو ہوگا کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اس کے ضمیر پر کسی قسم کا کوئی جبر نہ ہوگا۔ اس کی تہذیب، معاشرت، زبان اور رسم الخط کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ تمام باشندے چاہے وہ کسی قوم مذہب، ملت یا جنس کے ہوں سب کے لیے ایک ہی قانون ہوگا۔ سرکاری ملازمت پیشہ یا تجارت وغیرہ میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی جائے گی۔ سب کے حقوق یکساں ہوں گے اور انتخابات میں رائے دینے کا حق ہر بالغ کو دیا جائے گا۔

الیکشن کے اعلان میں کانگریس یہ عہد دہرا چکی ہے اور یہی کانگریس کے ہر طرزِ عمل کی بنیاد ہے۔ یہ اکثریت اور اقلیت دونوں کے لیے یکساں ہے اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ کانگریس کبھی اس وعدہ سے مکر جائے گی اور یہ عہد توڑ دے گی۔

ایسا پر خلوص قول دینے کے بعد کانگریس مذہبی اور معاشرتی معاملات میں اور زیادہ دخل دینا نہیں چاہتی اور سیاسی جہد میں کوشاں رہتی ہے۔ اس سیاسی جہد میں اس نے ایک بہت بڑی طاقت حاصل کر لی ہے کیونکہ لاکھوں آدمی اس کا ساتھ دے چکے ہیں اس کے پروگرام کی تائید کر چکے ہیں اور اپنی غلامی اور مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسی کی طرف نظر کرتے ہیں یہ پروگرام تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک مشترکہ پروگرام ہے جس میں کسی مذہب اور ملت کی قید نہیں۔ قومی تحریک کے زور پکڑنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طاقت دو مخالف صفوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور آج ہندوستان میں صرف دو ہی زبردست قوتیں برسرِ پیکار ہیں۔ ایک طرف کانگریس جو کہ ہندوستانیوں کے جذبۂ وطن پرستی کا ایک نام ہے اور دوسری طرف برطانوی سامراج۔ غلط ترجمہ کرنے کی وجہ سے میرے بارے میں اخباروں میں اکثر

چھپا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے کیونکہ چھوٹی بڑی مقتدر اور غیر مقتدر ملا کر لاتعداد جماعتیں ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اور اور جیسے میں سچ سمجھتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ آج ہندوستان میں فقط دو سر برآوردہ طاقتیں ہیں ایک کانگریس اور دوسری برطانوی سامراج۔ باقی ماندہ جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو کسی ایک کی طرفدار ہو جاتی ہیں یا ان کی حیثیت محض تماشائیوں کی سی ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں مانی جا سکتی۔ ہم آج سے پیشتر بہت سے سخت معرکے سر کر چکے ہیں اور جیسا کہ ملکوں اور قوموں کا قاعدہ ہے ہم نے ان لڑائیوں سے طاقت اور خود اعتمادی حاصل کی ہے ایک قوم کو تکلیف اور مصیبت کی بھٹی میں خود جلا کر کانگریس کے لوہے نے اپنے آپ کو فولاد بنایا ہے اور موجودہ آب و تاب پائی ہے اور لاکھوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت سے مضبوط ہو کر آج اس درجے پر پہنچی ہے۔ جو لوگ کہ اس سے کنارہ کش رہے اور ایک بیرونی اور ایک نہ ایک دن مٹ جانے والی حکومت کے کمزور سہارے پر بھروسہ کرتے رہے وہ خود ناتوان ہو گئے۔ اور ان کے کمزور دل و دماغ ایک متحرک قوم کے برقی پیام کا تحمل نہ لا سکے۔

محض تعداد یا قانون بنانے والی مجلسوں میں مخصوص نمائندگی کا حق یا باہر والوں کی مدد یا حمایت کسی قوم یا فرقہ کو طاقت نہیں پہنچا سکتی۔ یہ طاقت ایک اندرونی چیز ہے جو ایک مشترک جہد میں ساتھیوں کی رفاقت اور اشتراک عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اقلیتوں کے پنپنے کا دارومدار ان کی ذاتی صحت اور نشو و نما پر ہے نہ کہ کسی دوسرے کے سہارے پر۔ کیا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی اکثریت بہادر سکھوں کو دبا سکتی ہے حالانکہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ محض ایک سودائی ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی کوئی مذہبی اکثریت مسلمانوں پر زبردستی کر سکتی ہے اور ان کے حقوق پامال کر سکتی ہے۔

سیاسی اور اقتصادی معاملات میں کسی جماعت کا محض ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے حصہ لینے کا زمانہ اب گزر گیا ہے ممکن ہے کہ پیشتر ایسا ہو سکتا ہو لیکن آج یہ ناقابل قیاس ہے۔ اب تفرقوں کی نوعیت بدل گئی ہے اور یہ تقسیم آج اقتصادی خطوط پر ہے۔ ایسی صورت میں سیاسی معاملات پر ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے نظر ڈالنا ایک گزرے ہوئے زمانہ کے طرز عمل کو

اختیار کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیاسی میدان میں ہندوستان کی مذہبی جماعتیں اس قدر ناکامیاب رہتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی مشترک سیاسی یا اقتصادی نظریہ نہ تو ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ان میں عام طور پر ان معاملات میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر رجعت پسند ان جماعتوں پر قابو پا لیتے ہیں۔ اندرونی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے وہ لازمی طور پر اپنے سامراجی آقا کے الطاف و عنایات پر نظر رکھتی ہیں اور یہ الطافِ خسروانہ کیا ہیں؟ چند سرکاری نوکریاں یا اسمبلیوں اور کونسلوں میں چند کرسیاں۔ اس سے کروڑوں کی بھوک اور ناداری اور لاکھوں کی بے روزگاری کس طرح دور ہو سکتی ہے۔

یہ بات رفتہ رفتہ عوام کی سمجھ میں آتی جا رہی ہے اور جو لوگ فرقہ پرست رہنماؤں سے یہ امید کرتے تھے کہ وہ ان کا دکھ درد کسی حد تک دور کر سکیں گے وہ اب ان سے برگشتہ ہو کر کانگریس کی طرف راغب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور سیاسی اور اقتصادی نقطہ نظر سے معاملات پر غور کرنے لگے ہیں۔

ہم اکثر مسلم عوام سے ربط بڑھانے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی نیا پروگرام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس پر از سر نو زور دیا جا رہا ہو۔ یہ تو عوام سے رشتے مضبوط کرنے کا (چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی) جو ہمارا خاص پروگرام ہے اس کا فقط ایک جزو ہے۔ ان سب کا مذہب ان کا ذاتی معاملہ ہے جس کی ضامن کانگریس بن چکی ہے ہمارے لیے وہ مذہبی گروہ نہیں ہیں بلکہ عوام کی اس بڑی بھوکی اور مصیبت زدہ جماعت کا ایک جزو ہیں جن کے دلخراش نالے ہر طرف سے آ رہے ہیں اور جن کی آہیں فضا میں گونج رہی ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کانگریس میں ہمیشہ شریک رہی ہے اور اس سے بھی زیادہ افراد کی اس کے طرزِ عمل سے ہمدردی رہی ہے۔ ہمارے سب سے زیادہ با اقتدار رہنماؤں میں کچھ مسلمان رہ چکے ہیں اور اب بھی ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ مسلم عوام کا دل لینے میں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بہت بے پروائی کی ہے اب ہم اس بھول کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور کانگریس کا پیام ان تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس پر او رلوگ کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ اگر وہ

کانگریس کے سیاسی اور اقتصادی مقصد کے حامی نہیں ہیں تو ان کو پورا اختیار ہے کہ وہ اپنا نظریہ عوام کے سامنے پیش کریں لیکن یہ صدائے احتجاج عوام ہی کے سامنے بلند کرنا چاہیے۔

اہم بات یہی ہے کہ اپیل عوام سے کی جائے۔ ہمارے نزدیک ہمارے مسائل محض چوٹی کے چند آدمی مل کر طے نہیں کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ پرانی قسم کی آل پارٹیز کانفرنسوں ALL PARTIES CONFERENCES پر جن میں محض چند فرقوں اور گروہوں کے نمائندے جن کا کوئی مشترکہ سیاسی پس منظر نہیں ہوتا آپس میں ملتے ہیں اور لڑ جھگڑ کر مباحثہ ختم کر دیتے ہیں۔ ہمیں کوئی بھروسہ یا اعتبار نہیں رہا ہے۔ ہمیں ان کا کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس تجربے کے دہرانے کا نہ تو شوق ہے اور نہ تاب۔ ہم اپنی مشکلوں پر مباحثہ اور تبادلہ خیال کرنے کو ہمہ وقت تیار رہیں لیکن انھیں لوگوں سے جو دراصل ان کا حل چاہتے ہیں چاہے وہ ہمارے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان مشکلوں کا حل کسی نام نہاد آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعے سے ناممکن ہے۔

جو لوگ کہ کانگریس کا مسلمانوں سے معاہدہ یا سمجھوتہ کر لینے کی بات چیت کرتے ہیں وہ کانگریس کا نظریہ سمجھنے میں قطعی طور پر قاصر رہے ہیں اور وہ ان نئی طاقتوں کا اندازہ لگانے میں بھی جن کی تحریک عوام میں رونما ہو رہی ہے ناکامیاب رہے ہیں۔ ہم سب لوگ جو قومی اور اقتصادی آزادی چاہتے ہیں آپس میں پہلے ہی ایک مضبوط معاہدہ کر چکے ہیں کہ ہم اس مشترکہ مقصد کے لیے متفق ہو کر جہاد کریں گے۔ اس معاہدے میں بہت سے مسلمان بھی اسی طرح شریک ہیں، جیسے ہندو، سکھ یا عیسائی۔ سب بحیثیت ہندوستانی کے اس میں شامل ہیں اور اگر آپس میں کوئی معاملہ تصفیہ طلب ہے (جیسا کہ کبھی کبھی ہونا لازمی ہے) وہ اسے اس بڑی اور باوقعت جماعت میں جسے ہندوستانی عوام کی مرضی کا صحیح اور قابلِ قدر نمائندہ ہونے کا شرف حاصل ہے مباحثہ کر کے جمہوری طور پر طے کریں گے کیا یہ طریقہ ایک بیرونی حکومت کے پاس جو ہم کو دبائے ہوئے ہے اور جو ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے لڑانا چاہتی ہے وفد لے جانے خوشامد کرنے اور اس کی عنایات کے طالب ہونے سے زیادہ باعزت اور غیرت مند نہیں ہے۔؟

آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے لیے یہی ایک جمہوری طریقہ ہے اور جہد آزادی کے دوران میں بھی یہی ایک صورت نظر آتی ہے۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ایسی جماعتیں بنائی جائیں جو نیم مذہبی ہوں اور نیم قوم پرست مثلاً مسلم کانگریس پارٹی۔ میرے نزدیک یہ طریقہ غلط ہوگا اور اس سے فرقہ وارانہ ذہنیت اور بڑھے گی اور ہمارے اصلی اور بڑے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ ایک نیشنلسٹ مسلم پارٹی NATIONALIST MUSLIM PARTY پیشتر بھی بنائی گئی تھی جس کی یاد ہمارے لیے خوش گوار نہیں۔ ایسی کھچڑیاں تیار کرنے سے اصل نزاع کی صورت بدل جاتی ہے اور عوام چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ جو لوگ کہ کانگریس کے خلاف ہیں وہ یقیناً اپنی اپنی جماعتیں اور گروہ بنائیں گے مگر جو لوگ ہمارے موافق ہیں ان کو فقط دروازے تک آکر رک نہ جانا چاہیے بلکہ قومی ایوان میں اپنا حق سمجھ کر داخل ہونا چاہیے اور قوم کی پالیسی وضع کرنے میں ذمہ داری کے ساتھ پورا پورا حصہ لینا چاہیے آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو کانگریس والا کہتے ہیں اور جو مکمل آزادی حاصل کرنے کے موافق ہیں لیکن چونکہ وہ فرقہ وارانہ یا دوسری جماعتوں کے ماتحت کام کر رہے ہیں ان کی طاقت ضائع جا رہی ہے۔

ہندوستان کے عوام کو جلد ہی بہت سے اہم تصفیے جن پر ان کی قسمت کا دارومدار ہے کرنا پڑیں گے کیونکہ وقت کی نزاکت تیزی کے ساتھ روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ بالفعل یہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور چھوٹے نزاعات (فرقہ وارانہ وغیرہ) تاریکی میں پیچھے ہٹتے چلے جا رہے ہیں اور اصل سوالات کے بادل جن میں ہماری تقدیر مضمر ہے ہندوستان کیا ساری دنیا پر بڑھتے بڑھتے چھائے جا رہے ہیں۔ ہم چاہے ہندو ہوں یا مسلمان سکھ ہوں یا عیسائی ان کا کیا جواب دیں گے؟ کیا ہم تنگ نظری کے صحرا میں گم ہو کر اپنی پرانی کم ظرفی پر قائم رہیں گے یا متحد ہو کر اور اپنے ارادوں پر مستقل رہ کر آنے والے واقعات کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے وضع کریں گے اور اپنے لیے اپنی پسند کی تاریخ لکھیں گے؟

۴ر اپریل ۱۹۳۷ء

(۴)

میں نے مسٹر جناح کا سب میں آخری بیان بہت غور سے پڑھا ہے ۔ میں یہ بات اُن کی تسلیم کرتا ہوں کہ مسلم لیگ ایک سیاسی انجمن ہے جو سیاسی میدان میں گامزن ہے ۔ لیکن چونکہ وہ ایک مذہبی گروہ تک محدود ہے اس لیے اسی قسم کی اور جماعتوں کی طرح وہ بھی دراصل ایک مذہبی اور فرقہ دارانہ انجمن ہے میں کسی مذہبی جماعت کا محض مذہبی یا معاشرتی معاملات میں رہنمائی کرنا سمجھ سکتا ہوں اور اس کی خدمت کا اعتراف بھی کر سکتا ہوں ۔ اسی طرح ایک سیاسی انجمن کا سیاسی طور پر عمل پیرا ہونا بھی میرے قیاس میں آتا ہے چاہے اس کی رائے کچھ بھی ہو ۔ لیکن ان دونوں کی کھچڑی تیار کرنا ایک گڑبڑ پیدا کرنا ہے جس کی وجہ سے کسی سوال کا کوئی صحیح تصفیہ نہیں کیا جا سکتا ۔ مسٹر جناح یہ فرماتے ہیں کہ مسلم لیگ ایک سیاسی انجمن ہے اور اس کی پالیسی اور پروگرام اکثر بنیادی اور اہم باتوں میں کانگریس کے بالکل خلاف ہے ۔ محض ایک مسلمان گھر میں پیدا ہونے سے یا اسلام قبول کر لینے سے کسی شخص کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ مسلم لیگ کے نظریے اور طرزِ عمل کو بھی تسلیم کرے ۔ اگر وہ مسلم لیگ کی پالیسی کا حامی نہیں ہے ( جیسے کہ بہت سے مسلمان نہیں ہیں ) تو اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کسی دوسری سیاسی جماعت میں شریک ہو جس کے اصول اور مقاصد سے وہ متفق ہو ۔ اگر اس نے کانگریس کو پسند کیا تو وہ اس میں شریک ہوگا اور اپنا سیاسی جدوجہد اسی کے ماتحت کرے گا ۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مسلمانوں کا بدخواہ ہے یا ان کی تباہی چاہتا ہے ۔ وہ محض اپنے خیالات کے مطابق اپنے سیاسی رجحانات کی تکمیل کر رہا ہے جیسے کہ ہر صاحبِ عقل کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں وغیرہ میں آپس میں بھی شدید سیاسی اختلافات ہیں ان سب مذہبی گروہوں میں کانگریس والے اشتراکیت پسند، اشتراکیت کے مخالف، کمیونسٹ، لبرل، باغی، انقلاب پسند، نرم رو، تیز رفتار غرضکہ ہر ایک ذہنیت کے افراد ملیں گے اور اسی طرح اقتصادی معاملات میں بھی ان کی رائے مختلف ہوگی اور یہ مختلف اقتصادی نظاموں کے حامی ہوں گے ۔ یہ مختلف رائیں ملک کی مختلف سیاسی اور اقتصادی جماعتوں سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں ۔ لیکن مذہب کا نام لے کر ایک ایسی انجمن بنانا جو سیاسی

اور اقتصادی معاملات میں بھی دخل دے اور جوان تمام اصلی بنیادی اور اہم اختلافات کو آڑا کاٹ کر ایک مصنوعی محاذ قائم کرے خلافِ حقیقت ہے اور سیاسی اعتبار سے اسے ایک گروہ نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایسی جماعت (مسلم لیگ، ہندو سبھا اور سکھ لیگ کی طرح سے) ایک ہم مذہب گروہ کے محض اس جزو کے نمائندہ ہونے کی دعویدار بن سکتی ہے جو سیاسی اور اقتصادی معاملات میں ہم خیال ہے۔ لیکن یہ نمائندگی بھی صحیح اور صاف طور پر انجام نہیں دے پاتی کیونکہ یہ ہمیشہ اپنے آپ کو کسی مخصوص مذہبی گروہ کے مجموعی مطالبات کا وکیل بن کر پیش کرتی ہے اور اس کے تحفظ کا سوال اٹھاتی ہے حالانکہ اس مذہب کے افراد کی رائے اور ذہنیت کا جداگانہ ہونا لازمی ہے۔

میں لبرل پارٹی کی پالیسی سے بھی اتفاق نہیں کرتا لیکن کم سے کم میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔ یہ سیاسی جماعت ایک مخصوص سیاسی نظریے کے ماتحت برسرِ کار ہے اور اس کے دروازے ہندو مسلمان وغیرہ سب کے لیے یکساں کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ اور ہندو سبھا میں اس کی گنجائش نہیں۔

مسٹر جناح اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میری نیت اور جماعتوں کو مٹا دینے کی ہے تو انھوں نے دھوکا کھایا ہے اور وہ میرا مقصد سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ میں کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کا پورے طور پر حامی ہوں میں اپنی پوری کوشش کرتا ہوں کہ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ سب میرے ہم رائے ہو جائیں اور میرے نظریے کو قبول کریں۔ مسٹر جناح یا لبرل حضرات کو اور اسی طرح ہر فرد اور ہر گروہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسی طرح عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی پوری پوری کوشش کرے۔ مسٹر جناح کو اس بات کی شکایت کیوں ہے کہ میں مسلمانوں میں کانگریسی مقاصد کی اشاعت کر رہا ہوں اور کانگریس کا پیغام ان تک پہنچا رہا ہوں؟ یہ اعتراض کوئی سیاسی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ مذہبی ہے اور اسی سے ان کے دماغ کی گتھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس وقت مسٹر جناح مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں یا ان کو کسی بات سے روکتے یا متنبہ کرتے ہیں اس وقت وہ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے رہنمائی نہیں کرتے بلکہ ایک مذہبی

پیشوا بن کر ہدایت فرماتے ہیں ۔ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تمام مسلمان لازمی طور پر انھیں کے ہم خیال ہوں گے اور جو راہ کہ وہ اختیار کریں گے سب مسلمان اسی پر آنکھ بند کر کے چلنے لگیں گے ۔ یقیناً ایسا فرض کرنا صحیح نہیں اور اس میں دھوکے کی بہت بڑی گنجائش ہے ۔

مسٹر جناح سمجھتے ہیں کہ کانگریس کی پالیسی غلط اور قوم کے لیے مضر ہے ۔ یہی رائے میری ان کے طرز عمل کے بارے میں ہے ۔ ہماری رایوں میں اختلاف ہے ۔ مناسب تو یہی ہے کہ ہم دونوں اس اختلاف کو تسلیم کریں اور جمہوری طور پر اپنے اپنے خیالات اور نظریوں کی اشاعت کریں ۔ میں مسٹر جناح کا بڑا پُر جوش استقبال کروں گا اگر وہ کسی خالص سیاسی جماعت کے لیڈر بن کر ملک کے سامنے آئیں جس میں ہر مذہب کے افراد شریک ہو سکتے ہوں اور اپنا مخصوص سیاسی پروگرام پیش کریں ۔ ایسی صورت میں سیاسی اور اقتصادی مسائل صاف اور واضح ہو کر ملک کے سامنے آئیں گے ۔ اور عوام جن کو ان معاملات پر آخری فیصلہ کرنا ہوگا ۔ صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے مناسب طور پر غور اور فکر کر سکیں گے لیکن مسلمانوں کو محض ایک مذہبی گروہ قرار دے کر ان کے جذبات مشتعل کرنا اور پھر سیاسی معاملات میں ان سے رائے چاہنا ایک کھلا ہوا غلط طریقہ ہے ۔ یہ تو وہی پرانے جاگیردارانہ زمانے کا نقطۂ نظر ہے جب کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات پر کوئی نظر نہ کرتا تھا لیکن آج کی دنیا میں اس کا نبھنا ناممکن ہے یہی وجہ ہے جو میں یہ کہتا ہوں کہ میرے لیے فرقہ وارانہ ذہنیت سے معاملات پر نظر ڈالنا آسان نہیں ۔

مسٹر جناح کا یہ کہنا بھی بالکل بعید از انصاف ہے کہ کانگریس اقلیتوں کی پاسداری اور ان کے حقوق کے تحفظ کا خیال کرنا محض ایک پرلے سرے کی حماقت سمجھتی ہے ۔ سچ بات بالکل اس کے برعکس ہے ۔ جہاں تک کہ مذہب تہذیب اور زبان کا سوال ہے (اور عام طور پر اقلیتوں کے یہی بنیادی حقوق سمجھے جاتے ہیں) کانگریس جتنا کہ پُر خلوص اعلانات سے کیا جا سکتا ہے ان کی پورے طور پر ضامن اور محافظ بن چکی ہے ۔ ان کے علاوہ ممکن ہے کہ اور سوالات بھی غور طلب ہوں اور یقیناً اس کوتاہ بین اور ناقص دنیا میں ایسے اکثر موقعے پیشتر بھی آئے ہیں اور آئندہ بھی آئیں گے جب اقلیتوں کے حقوق کے متعلق کوئی سمجھوتہ کر لینا ہی پسندیدہ ہوگا ۔

کانگریس اس بات کی اہمیت بخوبی سمجھتی ہے اور جب کبھی ایسے موقعے آتے ہیں وہ ایسا سمجھوتا کرادینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے لیکن سیاسی سمجھوتے ایک بنیادی سیاسی پالیسی کے ماتحت ہی ہو سکتے ہیں بنیادی اصولوں کو توڑ کر کسی جزوی نزاع کو طے کر لینا سمجھوتا کرنا نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی ساری تعمیر کی اپنے ہاتھوں خود بنیاد کھودنا ہے اور ذہنی توازن کا پورے طور پر کھودینا ہے۔

کانگریس کمیونل ایوارڈ CONGRESS COMMUNAL AWARD فرقہ وارانہ تصفیہ کو نہ قبول کرتی ہے اور نہ قبول کر سکتی ہے کیونکہ یہ ایک متحد ہندوستان اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔ اس کو آزادی کا ضد سمجھنا چاہیے لیکن مسٹر جناح یہ بھی جانتے ہیں کہ کانگریس کی پالیسی یہ ہے کہ متعلقہ فرقوں کو ہم خیال بنا کر اور ان کی خوشنودی اور اشتراک عمل حاصل کر کے اس فیصلے کو تبدیل کرائے۔

جس وقت مسٹر جناح یہ فرماتے ہیں کہ مسلم لیگ کا کانگریس سے بہت سی اہم اور بنیادی سیاسی باتوں میں شدید اختلاف ہے تو کیا وہ یہ امید کرتے ہیں کہ کانگریس اور وہ مسلمان جو کانگریس کے متفق ہیں مسلم لیگ کا لحاظ کر کے اپنی سالہا سال کی پالیسی چھوڑ دیں جو منارۂ ساحل کر ایک مدت سے ان کی رہنمائی کر رہا ہے اس کی روشنی بجھادیں اور جس مقصد کے لیے ان میں سے ہزارہا افراد مصیبتوں کے ظلمات کی تاریک اور پُرخار وادیوں سے گزرے ہیں۔ وہ دل سے بھلادیں۔ مسٹر جناح بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری مصیبت کے وقت جبکہ ہم ایک مغرور سامراج کا مقابلہ کر رہے تھے مسلم لیگ کے بہت سے سربرآوردہ رہنما انگلستان کی کنزرویٹو پارٹی CONSERVATIVE PARTY کے کٹر لیڈروں سے جن سے زیادہ ہندوستان کی آزادی کا کوئی دشمن نہیں ساز کر گئے تھے۔ کیا ہم لوگ جنھوں نے اس سامراج کی زبردست اور ہولناک طاقت کو آمادۂ پیکار دیکھ کر بھی سر نہیں جھکایا اور جو جہدِ آزادی میں ہر قسم کی تازہ مصیبت جھیلنے اور قربانی کرنے کے لیے تیار ہیں کیونکہ یہی ان کی زندگی کا ایک مقصد ہے ان وطن فروشوں کے سامنے گردن نیچی کر سکتے ہیں۔

مسٹر جناح نے میرے عقیدۂ اشتراکیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں سامراجی حکومتوں کا خاتمہ چاہتا ہوں اور محض ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں ایک

اشتراکیت قائم ہونے کا متمنی ہوں ۔ میں ایک ایسے دنیاوی نظام کا قائل ہوں جو اشتراکیت کے اصولوں پر مبنی ہو اور مجھے یقین ہے کہ ہماری بدمزاجیاں اور مصیبتیں صرف اسی طرح ہمیشہ کے لیے دور ہو سکتی ہیں ۔ لیکن ابھی کانگریس کا تو یہ عقیدہ یا پالیسی نہیں ہے تاہم کانگریس عوام کا مفاد مدِ نظر رکھتی ہے انھیں سے طاقت حاصل کرتی ہے ۔ اس لیے اس کی رائے میں اقلیتوں سے سیاسی سمجھوتے کرنا اسی وقت مناسب اور دیرپا ہوں گے جبکہ عوام اس معاملے میں شریک ہوں اور اپنے مطالبات خود پیش کریں ۔

کیا میرے طرزِ گفتگو میں کوئی نادرشاہی انداز ہے ؟ ۔ یہ تو دوسروں کے طے کرنے کی بات ہے لیکن کیا میں مسٹر جناح سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ جس وقت وہ مسلمانوں تک کانگریسی پیام پہنچانے پر ہم سے خفا ہوتے ہیں یا تمام مسلمانوں کو بغیر اس کا خیال کیے کہ ان کی سیاسی رائے یا رجحان کیا ہے ۔ ہمارے خلاف متنبہ کرتے ہیں اور فتوے جاری کرتے ہیں اس وقت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں ہٹلریت کی آن آجاتی ہے ؟ ۔

۲ مئی ۱۹۳۷ء

---

# دو مسجدیں[۲]

(یہ مضمون پنڈت جواہرلال نہرو نے الموڑہ جیل میں اگست ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی میں لکھا تھا۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ پٹنہ سے ہندی میں شائع ہو چکا ہے اور یہ مضمون اس میں موجود ہے۔ مجموعہ شائع کرنے والوں نے ہندی پڑھنے والوں کے خیال سے کہیں کہیں پنڈت جی کے اصلی مضمون کے الفاظ کو ہندی الفاظ سے بدل دیا تھا۔ میں نے یہ مضمون اسی ہندی مجموعے سے لیا ہے اور کہیں کہیں ہندی الفاظ کے بجائے عام فہم اردو الفاظ استعمال کیے ہیں اس طرح میرا خیال ہے کہ اب یہ مضمون اصل کے قریب قریب مطابق ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے پنڈت جی کے پاس اصل مضمون کی کوئی کاپی موجود نہ تھی ورنہ مجھے خواہ مخواہ دخل دینے کی کوئی ضرورت پیدا نہ ہوتی۔)

آج کل اخباروں میں لاہور کی شہید گنج والی مسجد کا آئے دن کچھ نہ کچھ چرچا ہوتا ہے۔ شہر میں کافی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ دونوں طرف مذہبی جوش دکھائی دیتا ہے۔ ایک دوسرے پر حملے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بدنیتی کی شکایتیں ہوتی ہیں۔ اور بیچ میں ایک پنچ کی طرح انگریزی حکومت اپنی طاقت دکھلاتی ہے۔ مجھے نہ تو واقعات ہی ٹھیک ٹھیک معلوم ہیں کہ کس نے یہ سلسلہ پہلے چھیڑا تھا یا کس کی غلطی تھی اور نہ اس کی جانچ کرنے کی میری کوئی خواہش ہی ہے۔ اس طرح کے مذہبی جوش میں مجھے بہت دلچسپی بھی نہیں ہے۔ لیکن دلچسپی ہو یا نہ ہو پر جب بدقسمتی نے یہ جوش پیدا ہو جائے تو اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگ اس دیش میں کتنے پچھڑے ہوئے ہیں

کر ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں پر جان دینے کو آمادہ ہو جاتے ہیں پر اپنی غلامی اور فاقہ مستی سہنے کو تیار رہتے ہیں۔

اس مسجد سے میرا دھیان بھٹک کر ایک دوسری مسجد کی طرف جا پہنچا وہ ایک بہت مشہور تاریخی مسجد ہے اور قریب چودہ سو برس سے اس کی طرف لاکھوں کروڑوں نگاہیں دیکھتی آئی ہیں۔ وہ اسلام سے بھی پرانی ہے اور اس نے اس لمبی زندگی میں نہ جانے کتنی باتیں دیکھی ہیں۔ اس کے سامنے بڑے بڑے سامراج گرے، پرانی سلطنتیں تیار ہوئیں، مذہب بدلے، خاموشی سے اس نے یہ سب دیکھا اور ہر انقلاب اور تبدیلی پر اس نے اپنی پوشاک بھی بدلی۔ چودہ سو برس کے طوفانوں کو اس عالیشان عمارت نے برداشت کیا۔ بارش نے اس کو دھویا۔ ہوا نے اپنے بازوؤں سے اس کو رگڑا، مٹی نے اس کے بعض حصّوں کو ڈھانکا۔ بزرگی اور شان اس کے ایک ایک پتھر سے ٹپکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں دنیا بھر کا تجربہ اس ڈیڑھ ہزار سال نے بھر دیا ہے۔ اتنے لمبے زمانے تک قدرت کے کھیلوں اور طوفانوں کی برداشت مشکل تھی۔ لیکن انسانوں کی حماقتوں اور وحشتوں کا سہنا اس سے بھی زیادہ کٹھن تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی سہا۔ اس کے پتھروں کی خاموش نگاہوں کے سامنے سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ مذہب اٹھے اور بیٹھے۔ بڑے سے بڑے بادشاہ۔ خوبصورت سے خوبصورت عورتیں۔ لائق سے لائق آدمی چمکے اور اپنا راستہ ناپ کر غائب ہو گئے۔ ہر طرح کی ہمت اور بہادری ان پتھروں نے دیکھی اور ہر قسم کی بزدلی اور کمینہ پن بھی دیکھا۔ بڑے اور چھوٹے اچھے اور برے سب آئے اور چل بسے لیکن یہ پتھر ابھی قائم ہیں۔ آج بھی یہ پتھر اپنی اونچائی سے انسانوں کی بھیڑوں کو دیکھ کر اپنے دل میں کیا سوچتے ہوں گے؟ ان کے بچوں کے کھیل، ان کے بڑوں کی لڑائی، فریب اور بے وقوفی۔ ہزاروں برس میں انھوں نے کتنا کم سیکھا، کتنے دن اور لگیں گے کہ ان کو عقل اور سمجھ آئے۔

سمندر کی ایک پتلی سی بانھ (آبنائے) ایشیا اور یورپ کو وہاں الگ کرتی ہے۔ ایک چوڑی ندی کی طرح باسفورس BASPHORUS بہتا ہے اور دو دنیاؤں کو جدا کرتا ہے۔ اس کے یورپ والے کنارے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بائزنٹیم BYZANTIUM کی پرانی بستی تھی۔ بہت دنوں سے وہ رومن سلطنت میں شامل تھی جس کی پوربی سرحد عیسوی

کے شروع کی صدیوں میں عراق تک تھی۔ لیکن پورب کی طرف سے اس سلطنت پر اکثر حملے ہوتے تھے۔ روم کی طاقت کچھ کم ہو رہی تھی اور وہ اپنی دور دور کی سرحدوں کی ٹھیک طرح حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی پچھم اور اتر میں جرمن وحشی (جیساکہ رومن لوگ انھیں کہتے تھے) چڑھ آتے تھے اور ان کا ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور کبھی پورب میں عراق کی طرف سے یا عرب سے ایشیائی لوگ حملے کرتے اور رومن فوجوں کو ہرا دیتے تھے۔

روم کے شہنشاہ کانسٹن ٹائن CONSTAN - TINE نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی راجدھانی پورب کی طرف لے جائے تاکہ پوربی حملوں سے سلطنت کی حفاظت کر سکے۔ اس نے باسفورس BASPHORUS کے سندر کنارے کو چنا اور بائزینٹیم BYZANTIUM کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر ایک بڑا شہر بسایا۔ عیسوی کی چوتھی صدی ختم ہونے والی تھی جب قسطنطنیہ کا جنم ہوا۔ اس نئے بندوبست سے رومن سلطنت پورب میں ضرور مضبوط ہوگئی۔ لیکن اب پچھم کی سرحد اور بھی دور پڑ گئی۔ کچھ دن بعد رومن سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک پچھمی سلطنت اور ایک پوربی سلطنت۔ کچھ برس بعد پچھمی سلطنت کو اس کے دشمنوں نے ختم کر دیا لیکن پوربی سلطنت ایک ہزار برس سے زائد اور قائم رہی اور بائزینٹین سامراج BYZANTINE EMPIRE کے نام سے مشہور رہی۔

شہنشاہ کانسٹن ٹائن نے صرف راجدھانی ہی نہیں بدلی بلکہ اس سے بھی بڑی ایک تبدیلی کی۔ اس نے عیسائی دھرم قبول کیا۔ اس کے پہلے عیسائیوں پر روم میں بہت سختیاں ہوتی تھیں جو ان میں سے روم کے دیوتاؤں کو نہیں پوجتا تھا، یا شہنشاہ کے بت کی پرستش نہیں کرتا تھا اس کو موت کی سزا مل سکتی تھی۔ اکثر اسے ایک گھرے میدان میں بھوکے شیروں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا۔ یہ روم کی جنتا کی ایک بہت بڑی تفریح تھی۔ روم میں عیسائی ہونا ایک بڑے خطرے کی بات تھی۔ وہ تو باغی سمجھے جاتے تھے۔ اب یکایک زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ شہنشاہ خود عیسائی ہو گیا اور عیسائی دھرم سب سے زائد عزت کے قابل سمجھا جانے لگا۔ اب بیچارے پرانے دیوتاؤں کے پوجنے والے مشکل میں پڑ گئے اور بعد کے شہنشاہوں نے تو ان کو بہت ستایا

صرف ایک شہنشاہ جولین JULIAN پھر ایسے ہوئے جو عیسائی دھرم کو چھوڑ کر پھر دیوتاؤں کے پجاری بن گئے۔ لیکن اس وقت عیسائی مذہب زور پکڑ چکا تھا اس لیے بے چارے روم اور یونان کے پرانے دیوتاؤں کو جنگل کی پناہ لینی پڑی اور وہاں سے بھی وہ دھیرے دھیرے نکال دیے گئے۔

اس پوربی رومن سلطنت کے مرکز قسطنطنیہ میں شہنشاہوں کے حکم سے بڑی بڑی عمارتیں بنیں اور بہت جلدی وہ ایک بڑا شہر ہوگیا۔ اس وقت پورب میں کوئی بھی دوسرا شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ روم بھی بالکل پچھڑ گیا تھا۔ یہاں کی عمارتیں ایک نئے طرز کی بنیں اور ایک نئے فنِ تعمیر کی بنیاد پڑی جس میں محراب، گنبد، برج اور ستون وغیرہ نئی طرح کے تھے اور جس کے اندر دیواروں اور کھمبوں پر باریک پچہ کاری کا کام ہوتا تھا۔ یہ فنِ تعمیر بائزینٹین آرکی ٹکچر BYZANTIAN ARCHITECTURE کے نام سے موسوم ہوا۔ چھٹی صدی عیسوی میں قسطنطنیہ میں ایک عالیشان گرجا جو کہ اسی فنِ تعمیر کا ایک لاجواب نمونہ ہے بنایا گیا اور یہ سینکٹا صوفایا SANCTA SOPHIA یا سینٹ صوفایا کے نام سے مشہور ہوا۔

پوربی رومن سلطنت کا یہ سب میں بڑا گرجا تھا اور شہنشاہوں کی یہ آرزو تھی کہ اپنی شان اور عظمت میں یہ گرجا بے نظیر بنے اور ان کی شہنشاہیت کے شایاں ہو۔ ان کی مراد پوری ہوئی اور یہ گرجا بائزینٹین آرٹ کی سب سے بڑی فتح (شاہکار) سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں عیسائی مذہب کے دو ٹکڑے ہوگئے (ہونے کو تو کئی ہوئے لیکن دو بڑے ٹکڑوں کا ذکر ہے) اور روم اور قسطنطنیہ میں مذہبی لڑائی چھڑی۔ وہ ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ روم کا بڑا پادری پوپ ہوگیا اور یورپ کے پچھمی دیشوں میں وہ بڑا مانا جانے لگا۔ لیکن پوربی رومن سلطنت نے اس کو نہیں مانا اور وہاں کا عیسائی فرقہ الگ ہوگیا۔ یہ فرقہ آرتھوڈاکس چرچ ORTHODOX CHARCH کہلایا جانے لگا یا اکثر یونانی چرچ بھی کہلاتا تھا کیونکہ یہاں کی زبان یونانی ہوگئی تھی۔ یہ آرتھوڈاکس چرچ روس اور اس کے آس پاس بھی پھیلا تھا۔

سینٹ صوفایا کا گرجا گھر چرچ کا مرکز تھا اور نوسو برس تک وہ ایسا ہی رہا بیچ میں ایک دفعہ روم کے طرفدار عیسائی (جو مسلمانوں سے جہاد کرنے آئے تھے) قسطنطنیہ پر ٹوٹ پڑے

اور اس پر انھوں نے قبضہ بھی کر لیا لیکن وہ جلدی ہی نکال دیے گئے۔

آخر میں جب پوربی سلطنت ایک ہزار برس سے زیادہ چل چکی تھی اور سینٹ صوفایا کی عمر بھی لگ بھگ نو سو سال کی ہو رہی تھی تب ایک نیا حملہ ہوا جس نے اس پرانی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر فتح پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کا جو سب سے بڑا عیسائیوں کا گرجا تھا وہ اب سب سے بڑی مسجد ہو گیا۔ سینٹ صوفایا کا نام آیہ صوفیہ پڑ گیا۔ اس کی یہ نئی زندگی بھی لمبی نکلی (سینکڑوں برسوں کی) ایک طرح سے وہ عالی شان مسجد ایک ایسی نشانی بن گئی ہے جس پر دور دور سے نگاہیں آکر ٹکراتی تھیں اور بڑے بڑے منصوبے گانٹھتی تھیں۔ انیسویں صدی میں ترکی شہنشاہیت کمزور ہو رہی تھی اور روس بڑھ رہا تھا۔ روس اتنا بڑا دیش ہونے ہوئے بھی ایک بند دیش تھا۔ اس کی سلطنت بھر میں کوئی ایسا کھلا بندرگاہ نہیں تھا جو سردیوں میں برف سے خالی رہے اور کام آسکے اس لیے وہ قسطنطنیہ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اس سے بھی زیادہ دل آویز پرانے روحانی اور معاشرتی رشتے تھے۔ روس کے زار اپنے آپ کو پوربی رومن شہنشاہیت کے وارث سمجھتے تھے اور ان کی پرانی راجدھانی کو اپنے قبضے میں لانا چاہتے تھے دونوں کا مذہب وہی آرتھوڈاکس گریک چرچ تھا جس کا نام گرجا سینٹ صوفایا تھا۔ روس کو اس کی تاب نہ تھی کہ اس کے مذہب کا سب سے پرانا بڑا اور مشہور گرجا مسجد بنا رہے اس کے اوپر جو ہلال بنا ہوا تھا وہ اس کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کے بجائے گریک کراس (یونانی صلیب) یہاں لگایا جائے۔

دھیرے دھیرے انیسویں صدی میں زاروں کا روس قسطنطنیہ کی طرف بڑھتا گیا جب قریب آنے لگا تو یورپ کی اور طاقتیں گھبرائیں۔ انگلستان اور فرانس نے رکاوٹیں ڈالیں لڑائی ہوئی اور روس کچھ رکا۔ لیکن پھر وہی کوشش جاری ہو گئی اور پھر وہی سیاسی داؤں پیچ چلے جانے لگے۔ آخرکار ۱۹۱۴ء کی بڑی لڑائی شروع ہوئی اور اس میں انگلستان، فرانس، روس اور اٹلی میں خفیہ سمجھوتے ہوئے۔ دنیا کے سامنے تو آزادی اور چھوٹے دیشوں کے خود مختار قائم رہنے کے لیے اعلیٰ مقصد رکھے گئے لیکن پردے کے پیچھے گِدھوں کی

طرح لاش کے انتظار میں اس کے بٹوارے کے منصوبے طے کیے گئے۔

پر یہ منصوبے بھی پورے نہیں ہوئے۔ اس لاش کے ملنے سے پہلے زاروں والا روس ہی ختم ہوگیا۔ وہاں انقلاب آیا اور حکومت اور سماج دونوں ہی کا تختہ پلٹ گیا۔ بالشوکوں نے تمام پرانے خفیہ سمجھوتے یہ دکھانے کو کہ یورپ کی بڑی بڑی سامراجی طاقتیں کتنی دھوکے باز ہیں ظاہر کر دیے۔ ساتھ ہی اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ وہ (بالشوک) شہنشاہیت کے خلاف ہیں اور کسی دوسرے دیش پر اپنا اختیار نہیں جمانا چاہتے اور ہر قوم کو آزاد رہنے کا حق ہے۔

یہ صفائی اور رنیک نیتی پچھم کی جیتنے والی طاقتوں کو پسند نہیں آئی۔ اُن کی رائے میں خفیہ ارادوں کا ڈھنڈورا پیٹنا شرافت کی نشانی نہیں تھا۔ اور اگر روس کی نئی حکومت نالائق نکلی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے اچھے شکار سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ انھوں نے (خاص کر انگریزوں نے) قسطنطنیہ پر قبضہ کیا۔ چار سو چھیاسی سال بعد اس پرانے شہر کی حکومت اسلامی ہاتھوں سے نکل کر پھر عیسائی ہاتھوں میں آئی۔ سلطان اور خلیفہ ضرور موجود تھے لیکن وہ ایک گڈے کی مانند تھے۔ جدھر موڑ دیے جائیں ادھر ہی گھوم جاتے تھے۔ آیا صوفیہ بھی حسب معمول کھڑی تھی اور مسجد تھی لیکن اس کی وہ شان کہاں جو آزاد وقت میں تھی جب خود سلطان اس میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے تھے۔ سلطان نے سر جھکایا۔ خلیفہ نے غلامی تسلیم کی لیکن چند ترک ایسے تھے جن کو یہ قبول نہ تھا۔ ان میں سے ایک مصطفیٰ کمال تھا جس نے غلامی سے بغاوت کو بہتر سمجھا۔

اس عرصے میں قسطنطنیہ کے ایک اور وارث اور حقدار پیدا ہوئے۔ یہ یونانی لوگ تھے۔ لڑائی کے بعد یونان کو مفت میں بہت سی زمین ملی اور وہ پرانی پوربی رومن سلطنت کے خواب دیکھنے لگا۔ ابھی تک روس راستے میں تھا اور ترکی تو موجود ہی تھا۔ اب روس مقابلے سے ہٹ گیا اور ترک ہارے ہوئے پریشان پڑے تھے۔ راستہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ انگلستان اور فرانس کے بڑے بڑے آدمیوں کو بھی راضی کر لیا گیا۔ پھر دقت کیا رہی؟۔

لیکن ایک بڑی دقت تھی اور وہ دقت تھی مصطفیٰ کمال پاشا۔ اس نے یونانی حملے کا مقابلہ کیا اور اپنے دیش سے یونانی فوجوں کو بُری طرح ہرا کر نکالا۔ اس نے سلطان خلیفہ کو جس نے

اپنے ملک کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا ایک غدار کہہ کر نکال دیا اس نے ملک سے سلطنت اور خلافت دونوں کا سلسلہ ہی مٹا دیا۔ اس نے اپنے گرے اور تھکے ہوئے ملک کو ہزار دشواریوں اور دشمنوں کے سامنے کھڑا کیا اور اس میں پھر نئی روح پھونک دی۔ سب سے بڑی تبدیلیاں جو اس نے کیں وہ مذہبی اور معاشرتی تھیں۔ عورتوں کو پردے سے باہر نکال کر قوم میں سب سے آگے رکھا۔ اس نے مذہبی تعصب کو بالکل کچل دیا اور کٹر پنے کو سر اٹھانے نہ دیا۔ اس نے سب میں نئی تعلیم پھیلائی اور ہزاروں برس کے پرانے رواجوں اور طریقوں کو ختم کر دیا۔

پرانی راجدھانی قسطنطنیہ کو بھی اس نے اس عظمت سے گرا دیا۔ ڈیڑھ ہزار برس سے وہ دو بڑی سلطنتوں کی راجدھانی رہی تھی۔ اب ایشیا میں انگورا (ایک چھوٹا سا شہر لیکن ترکوں کی نئی طاقت کا ایک نمونہ) کو راجدھانی بنایا۔ قسطنطنیہ کا نام بھی بدل گیا۔ اب اس کا نام استنبول ہو گیا۔

اور آیہ صوفیہ؟ اس کا کیا حشر ہوا؟۔ وہ چودہ سو برس کی عمارت اسطنبول میں کھڑی ہے اور زندگی کے اونچ نیچ کو دیکھتی جاتی ہے۔ نو سو برس تک اس نے یونانی مسیحی گانے سنے اور طرح طرح کی خوشبوئیں جو یونانی پوجا میں جلائی جاتی ہیں سونگھیں۔ پھر چار سو اسی برس تک عربی اذان کی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور نماز پڑھنے والوں کی قطاریں اس کے پتھروں پر کھڑی ہوئیں۔

اور اب!۔

ایک دن کچھ مہینوں کی بات ہے (اسی سال ۱۹۳۵ء میں) غازی مصطفیٰ کمال پاشا (جن کو اب خاص خطاب اور نام اتاترک کا دیا گیا ہے) کے حکم سے آیہ صوفیہ مسجد نہیں رہی۔ بغیر کسی دھوم دھام کے وہاں کے مجاور ہٹا دیے گئے اور دوسری مسجدوں میں بھیج دیے گئے۔ اب یہ طے ہوا کہ آیہ صوفیہ بجائے مسجد کے ایک عجائب گھر ہو خصوصاً بائزنیٹین

BYZANTIAN

فنون کی۔ بائزنیٹین زمانہ ترکوں کے آنے سے پہلے کا مسیحی زمانہ تھا۔ ترکوں نے قسطنطنیہ پر ۱۴۵۲ء میں قبضہ کیا تھا۔ اس وقت سے سمجھا جاتا ہے کہ بائزینٹین آرٹ ختم ہو گیا۔ اس لیے اب آیہ صوفیہ ایک طرح سے پھر عیسائی زمانے کو واپس چلی گئی۔ کیوں! مصطفیٰ کمال کے حکم سے۔

آج کل وہاں زوروں سے کھدائی ہو رہی ہے۔ جہاں جہاں مٹی جم گئی تھی ہٹائی جا رہی ہے اور پرانی پچہ کاری نکل رہی ہے۔ بائزینٹیں آرٹ کے جاننے والے امریکہ اور جرمنی سے بلائے

گئے ہیں اور انھیں کی نگرانی میں کام ہو رہا ہے ۔ پھاٹک پر عجائب خانہ کی تختی لٹک رہی ہے اور دربان بیٹھے ہیں ان کو آپ اپنی چھتری چھڑی دیجیے ان کا ٹکٹ لیجیے اور اندر جا کر اس پرانے مشہور آرٹ کے نمونے دیکھیے اور دیکھتے دیکھتے اس دنیا کی عجیب و غریب تاریخ پر غور کیجیے ۔ اپنے دماغ کو ہزاروں سال آگے پیچھے دوڑائیے ۔ کیا کیا تصویریں ۔ کیا کیا تماشے ۔ کیا کیاں جوانمردیاں ۔ کیا کیا ظلم آپ کے سامنے آتے ہیں ۔ ان دیواروں سے کہیے کہ وہ آپ کو اپنی کہانی سنائیں ۔ اپنے تجربے آپ کو دے دیں ۔ شاید کل اور پرسوں جو گزر گئے ان پر غور کرنے سے ہم آج کو سمجھیں اور آنے والے کل اور پرسوں کے پردوں کو بھی ہٹا کر ہم جھانک سکیں ۔

لیکن وہ پتھر اور دیواریں خاموش ہیں ۔ انھوں نے اتوار کی مسیحی پوجا بہت دیکھی اور جمعہ کی مسلمانی نمازیں بھی بہت سنیں ۔ اب ان کے سایے میں روزانہ کی نمائش ہے ۔ دنیا بدلتی رہی لیکن وہ قائم ہیں ۔ اُن کے گھسے ہوئے چہرے پر کچھ ہلکی سی مسکراہٹ معلوم ہوتی ہے اور ایک دھیمی سی آواز کانوں میں آتی ہے

" انسان بھی کتنا بے وقوف اور جاہل ہے کہ وہ ہزاروں برس کے تجربے سے نہیں سیکھتا اور بار بار وہی حماقتیں دہراتا چلا جاتا ہے "

# ایک جج کی ذہنیت[1]

آج مجھے اپنی وکالت کا زمانہ ایک بھولا ہوا خواب سا معلوم ہوتا ہے اور میرے لیے اس وقت کے خیالات احساسات اور دماغی کیفیات کی یاد تازہ کرنا اب کسی قدر دشوار ہو گیا ہے۔ حالانکہ قانون کے جال سے نکلے ہوئے (ایک سے زائد اعتبار سے) مجھے ابھی صرف سولہ ہی سال ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں کیونکہ قید خانہ میں انسان پرانی باتوں کو سوچنے لگتا ہے اور چونکہ موجودہ زمانہ بے رنگ، یکساں اور رنج وغم سے پُر ہوتا ہے لہٰذا عہدِ ماضی کے نقوش اور بھی زیادہ رنگین، شوخ اور جاذبِ نظر بن کر ابھرتے ہیں۔ میرے ماضی وکالت میں شاید ہی کوئی چیز قابلِ توجہ ہو اور آج تک میرے دل میں اس کی طرف مڑ کر نظر ڈالنے کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ پھر بھی میرا دماغ اکثر اس زمانے کے امکانات کے متعلق خیال آرائیاں کرتا ہے۔ (جب انسان مجبوراً بے کار ہو تو یہ ایک انتہائی دلچسپ شغلِ بے کاری ہے گو احمقانہ ضرور ہے) اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں نے وکالت چھوڑ نہ دی ہوتی تو زندگی میرے ساتھ کیا سلوک کرتی اور میری کس طرح گزر رہی ہوتی اُس وقت کے لیے یہ کوئی ایسی خلافِ قیاس بات بھی نہ تھی گو اب عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ قسمت کے تاگے کا ایک ذرا سا بل زندگی کے مستقبل کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے میرا خیال ہے کہ اگر میں وکالت کرتا ہوتا تو بحیثیت وکیل کے غالباً میرا شمار کامیاب وکیلوں میں ہوتا

---

[1] یہ مضمون جیل خانے میں ستمبر ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا تھا اور پہلے پہل موڈرن ریویو MODERN REVIEW میں شائع ہوا تھا۔

اور موجودہ زندگی کے مقابلے میں میری حیات بہت زیادہ سکون بخش سادہ بے رنگ اور جسمانی آسائش کے اعتبار سے کہیں زیادہ پُرعیش اور آرام دہ ہوتی۔ ممکن ہے کہ شاید میں بھی اپنے بہت سے پُرانے دوستوں اور ساتھیوں کی طرح سفید بالوں والی ٹوپی اور کالے گاؤن سے آراستہ ہو کر ایک نہایت معزز اور سنجیدہ صورت جج بن گیا ہوتا۔

بہ حیثیت جج کے میرے احساسات کیا ہوتے اس بارے میں میں نے اکثر غور کیا ہے۔ ایک جج کا دل و دماغ کس طرح کام کرتا ہے؟ یہ دوسرا سوال تو ایام وکالت میں بھی کسی حد تک میرے دماغ میں چکر لگایا کرتا تھا خصوصاً جبکہ میں خود فوجداری کے مقدموں کی پیروی کرتا یا ان کو دیکھتا تھا اور جس تیزی اور بظاہر لاپرواہی سے عدالتیں ملزموں کو پھانسی کی یا لمبی لمبی قید کی سزائیں دیتی تھیں ان کو سن کر مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور میں اکثر خیال میں گم ہو جاتا تھا۔ یہی سوال اس سے بھی زیادہ ذاتی طور پر میرے سامنے اس وقت آتا تھا جبکہ میں خود ملزم کی حیثیت سے قیدیوں کے کٹہرے میں حکم سننے کے لیے کھڑا ہوتا تھا یا کسی سیاسی جرم پر اپنے کسی دوست کا مقدمہ دیکھنے عدالت جاتا تھا۔ اور جیل خانے میں تو یہ سوال قریب قریب ہر وقت میرے پیشِ نظر رہتا ہے کیونکہ یہاں تو میرے ارد گرد سیکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے قیدی ہیں جن کو ججوں نے یہاں بھیجا ہے (اس وقت میرا مطلب عام قیدیوں سے ہے اور فقط سیاسی قیدیوں کی طرف اشارہ نہیں ہے)

جج نے تو محض ملزم کے مجرمانہ فعل پر شہادت کے اعتبار سے غور کیا اور قانون تعزیرات کے مطابق اُسے سزا دی۔ کبھی کبھی غالباً کسی خاص سخت سزا کو جائز ثابت کرنے کے لیے اس نے فیصلے میں اپنا ایک وعظ بھی جوڑ دیا۔ اس نے مجرم کے ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت (عدم تعلیم و تربیت کہنا چاہیے) کی طرف کوئی خیال نہیں کیا۔ اس نے کٹہرے میں کھڑے ہونے والے اس گونگے اور خوف زدہ انسان کی دماغی کشمکش کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور نہ اس نے اس نفسیاتی پس منظر ہی کی طرف نگاہ کی جو غالباً دراصل ارتکابِ جرم کا باعث تھا۔ اس کے دل میں تو شاید کبھی یہ شبہہ بھی پیدا نہ ہوا کہ وہی تہذیب و تمدّن جس کا اپنے آپ کو وہ ایک رکن اور زیور سمجھتا ہے ممکن ہے کہ کسی حد تک اس جرم کی ذمہ دار ہو جس کا وہ فیصلہ کرنے بیٹھا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ وہ جج ایک نہایت منصف مزاج ایماندار اور

نیک نفس انسان ہے جو بغیر شہادت کو بخوبی جانچے سزا نہیں دیتا۔ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ وہ شک کا فائدہ ملزم ہی کو دیتا ہے (حالانکہ ہمارے جج عام طور پر اس کمزوری سے بے گانہ ہیں اور ان کے دلوں میں شکوک ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں) لیکن پھر بھی قریب قریب ہمیشہ ملزم اور وہ دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کوئی چیز بھی شاید مشترک نہیں اور جو ایک دوسرے کے سمجھنے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ ممکن ہے کہ شاذونادر کبھی کوئی جج ملزم کے دل و دماغ اور ماحول کا ذہنی طور پر اندازہ لگا سکے لیکن اس کی ذہنیت کا جذباتی شعور اسے کبھی نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے ملزم کے افعال کو صحیح طور پر سمجھنا ناممکن ہے۔

سزائیں دی جاتی ہیں اور ان سزاؤں کی داستان بھی عجیب وغریب ہے۔ جتنا ہی یہ معلوم ہوتا جاتا ہے کہ جرائم میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو رہا ہے اتنی ہی وحشیانہ اور ہولناک سزائیں اور ہمک ہمک کے دی جاتی ہیں تاکہ جرم کرنے والا اس سزا کے خوف کی وجہ سے ارادۂ جُرم سے باز آئے۔ ججوں نے اور اس طاقت نے جو ججوں کے پس پشت ہے ابھی نہ تو اس حقیقت کو سمجھا ہے کہ جُرم کرنے کے خاص اسباب ہوتے ہیں جن کو تفتیش سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور جن میں سے کم سے کم کچھ قابو میں لائے جا سکتے ہیں اور نہ یہ جانا ہے کہ تعزیری قانون کی سختی کسی گروہ کے اخلاقی یا سماجی معیار کو بلند نہیں کر سکتی اور نہ ایک جابرانہ سزا کسی خطاوار فرد کو سدھار سکتی ہے۔ ان کے یہاں تو سیاسی اور غیر سیاسی دونوں قسم کے جرائم کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ایسی سزا دی جائے کہ مجرم تھرتھرا اٹھے اور دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ آج کل کسی ایسی تقریر یا نظم یا گانے کی سزا جو حکومت کی ناگواریٔ خاطر کا باعث ہو اور عام طور پر دو سال (سرحدی صوبے میں یہ تین سال ہے) رکھی گئی ہے اور ان کو روزانہ نہایت دریا دلی کے ساتھ تقسیم کیا جا رہا ہے لیکن جب ہم ان کثیر التعداد بدنصیبوں کی مثال پر غور کرتے ہیں جو چار چار یا پانچ پانچ سال بلکہ اس سے بھی زائد زمانے سے بغیر کوئی مقدمہ ہوئے یا بغیر کسی جرم میں سزایاب ہوئے جیل خانوں میں بند ہیں تو اس کے مقابلے میں یہ سخت سزائیں بھی ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن سیاسی مجرموں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اس کی مثالیں ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی مدد نہیں دیتیں کہ قانونِ تعزیرات کا نفاذ عام طور پر کیسے کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا دارومدار

بہت کچھ حکومت کی اس وقت کی مزاجی کیفیت پر اور ان حالات اور واقعات پر ہوتا ہے جو تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ایک سے نہیں رہتے کبھی کبھی تو یہ ایک دوسرے کی حد میں آجاتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر بھی ڈالتے ہیں مثلاً بہت سے مقدمات جو آراضی اور مزدوروں کے متعلق ہوتے ہیں وہ اکثر دراصل کسی سیاسی تحریک کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ بہت سے ان لوگوں کے خلاف جن کا آزاد رہنا پولیس کے نزدیک سیاسی اعتبار سے نامناسب ہے آوارہ گردی یا اسی قسم کی کوئی اور ضابطۂ فوجداری کی دفعہ قائم کر کے مقدمہ چلا دیا جاتا ہے اور بغیر کوئی خاص جرم ان پر لگائے انھیں بدمعاش قرار دے کر جیل خانوں میں بند کر دیا جاتا ہے ان سے قطع نظر کر کے اور محض انھیں مثالوں پر جنھیں خالص جرائم کہا جا سکتا ہے غور کرنے سے دو باتیں صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تعداد جرائم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور دوسرے یہ کہ سزا کی سختی اور معیاد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر سال مختلف صوبوں کے جیلوں کی رپورٹیں قیدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کو رکھنے کے لیے جگہ کی قلت کی شکایتوں سے پر ہوتی ہیں۔ وہ چوٹی کے سال جب سول نافرمانی کرنے والے مجرموں نے ہزاروں کی تعداد میں جا کر جیل خانے بھر دئے تھے اب بغیر ان کے جائے ہوئے بھی قیدیوں کی تعداد کے اعتبار سے معمولی سال بن گئے ہیں کبھی کبھی اس مشکل کو یوں بھی حل کیا جاتا ہے کہ چند ہزار ایسے قیدی جن کی سزا کی میعاد کم ہے چھوڑ دیے جاتے ہیں لیکن پھر بھی مشکل بدستور باقی رہتی ہے۔

ہمارے سنٹرل جیل ان قیدیوں سے جن کو حبسِ دوام کی یا دس دس بارہ بارہ سال کی سزا دی گئی ہے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو ڈاکہ زنی یا اسی قسم کے دیگر جرائم میں ماخوذ ہو کر یکبارگی غول کے غول کی صورت میں داخل ہوتے ہیں اور غالباً ان میں سے کافی تعداد نے جرم کیا بھی ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ بے گناہ بھی ہوتے ہیں کیونکہ ثبوت کی شہادت کا عام طور پر سارا دارو مدار شناخت پر ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ڈکیتیوں کی اتنی افراط ہمارے عوام اور کم حیثیت درمیانی طبقے کی روز افزوں بے روزگاری اور مفلوک الحالی کا نتیجہ ہیں۔ اکثر دیگر جرائم کا باعث بھی جن کا تعلق مال غصب کر لینے سے ہے یہی ہولناک ناداری اور فاقہ مستی ہے جس کا زیادہ تر لوگوں کو آئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کیا ہمارے جج کبھی اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں یا اس مکمل مایوسی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو بیوی بچوں کو فاقہ کرتے ہوئے دیکھ کر ایک معمولی احساسات رکھنے والے انسان کے دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے؟ کیا انسان اپنے سب سے قریبی عزیزوں کو سادہ ترین ضروریات زندگی مہیا نہ کر سکنے کی وجہ سے بیمار پڑتے اور دم توڑتے دیکھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہ سکتا ہے؟۔ اس سے لغزش ہوتی ہے اور وہ قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے بعد قانون اور جج مل کر اس بات کا پورا پورا انتظام کر لیتے ہیں کہ اس غریب کو ایک معمولی انسان کی حیثیت سے سماج کی معاشرتی زندگی میں کوئی کارآمد کام کرنے کا پھر کبھی کوئی موقع نہ ملے۔ وہ خود اس ذہنیت کے پیدا کرنے کے ذمے دار ہیں جس کو مجرمانہ کہا جاتا ہے اور پھر خود ہی حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ اس قسم کے افراد میں کہ اور بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

سنگین جرائم میں تو حبس دوام یا دس سال کی سزادی جاتی ہے۔ لیکن معمولی جرائم کے ارتکاب پر جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ اُن سے بھی زیادہ سبق آموز ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو عدالتی کاغذات میں دفن ہیں اور منظر عام پر نہیں آتیں (شاذ و نادر اخباروں میں کسی ایسے مقدمے کی خبر شائع ہوتی ہے) تین ایسی مثالیں جو تازہ روزناموں سے بغیر کسی انتخاب کی نیت کے لی ہیں پیش کرتا ہوں۔

رحمٰن ایک پرانا خطاوار تھا جو بارہ مرتبہ سزایاب ہو چکا تھا اور پہلے پہل ۱۹۱۳ء میں ماخوذ ہوا تھا۔ اس بار اس نے کچھ کپڑے چرائے تھے جن کی قیمت محض تین چار روپے تھی۔ رحمٰن نے ارتکاب جرم کا اقبال کیا اور عدالت سے یہ دست بستہ درخواست کی کہ اسے کسی دارالاصلاح REFORMATORY یا کسی اور ایسی جگہ بھیج دیا جائے جہاں اس کا چال چلن سدھر سکے جج نے جو کہ سندھ کے جوڈیشنل کمشنر صاحب تھے اس کی استدعا نامنظور کی اور اسے سات سال کی سزادی اور فیصلے میں یہ ٹکڑا جوڑ دیا کہ اگر یہ سات سال کی سزائے سخت تمہاری اصلاح نہیں کر سکتی تو پھر سوائے ذاتِ خدا کے اور کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ (کراچی ۲۲ مئی ۱۹۳۵ء)

بدری کو جو کہ چار مرتبہ کا سزایافتہ تھا حسب دفعات ۴۱۱ و ۷۵ تعزیرات ہند دو سال کی قید سخت دی گئی۔ اس کے قبضے سے ایک سوتی چادر جو کہ مال مسروقہ کہی جاتی تھی برآمد ہوئی تھی (لکھنؤ ۳ جولائی ۱۹۳۵ء)

غلام محمد ایک عادی مجرم کو ایک شخص کی جیب سے ایک روپیہ نکال لینے پر تین سال کی قید سخت دی گئی۔ (سیالکوٹ ۱۵ جولائی ۱۹۳۵ء)

یہ اور اسی قسم کی اور سزائیں ممکن ہے کہ تعزیراتِ ہند کے اعتبار سے بالکل مناسب اور صحیح ہوں لیکن کسی جج کا یہ سمجھنا کہ وہ ایسی سزائیں دے کر مجرم کی اصلاح کر رہا ہے میرے لیے نہایت حیرت انگیز ہے۔ غالباً سندھ کے جوڈیشنل کمشنر صاحب کے دل میں اپنے طرزِ علاج کے کارآمد ثابت ہونے کے بارے میں کافی شکوک تھے کیونکہ انھوں نے خود اشارہ کیا ہے کہ اگلے موقع پر یہ خدمت اللہ میاں کے سپرد کی جائے۔

عدالتوں کے کمروں میں روزانہ مقررہ اوقات پر یہ جج شان سے بیٹھتے ہیں اور مصیبت کے مارے ہوئے بدنصیبوں کی ایک مسلسل برات ان کے سامنے سے گزرتی ہے۔ ان میں سے کچھ پھانسی کے ہولناک تختے تک پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ کوڑوں کی مار کھاتے ہیں اور زیادہ تر مختلف میعادوں کی سزائیں پاتے ہیں جن میں کبھی کبھی قیدِ تنہائی بھی شامل کر دی جاتی ہے۔ انصاف کرنے اور سزا دینے کے متعلق ان کے کچھ فرسودہ دور از کار اور موہوم خیالات ہیں اور وہ انھیں کے ماتحت اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ اس خیال کو اپنے دل سے دور نہیں کر سکتے کہ وہ سماج کے محافظ ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ موجودہ نظام کو ان مجرمانہ عناصر سے بچائیں جو موجودہ تمدّن یا معاشرت کی تخریب کے درپے ہیں۔ ان کے خیالات اس محدود دائرے کو چھوڑ کر انسانیت کی سطح تک کبھی نہیں آتے اور وہ ملزم کے بارے میں یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ بدنصیب بھی ایک انسان ہے اور انسانوں کی طرح اس کے بھی ماں باپ بیوی بچے عزیز اور دوست ہیں وہ ایک فرد کو سزا دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک گروہ کو بھی سزا دیتے ہیں کیونکہ مصیبت کی لہریں بڑی دور دور تک پھیلتی ہیں۔ جو لوگ کہ جان دیتے ہیں وہ کم سے کم جلدی مر جاتے ہیں اور ان کی جان کنی کی تکلیف مختصر ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ کہ جیل خانوں میں عمریں گزارتے ہیں ان کا دردناک گفتہ یہ ہے ؎

اونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے<br>
بیٹھے ہیں مقفل کچھ انساں انساں جو نہیں اک گنتی ہیں

چھوٹی سی زندگی میں سے تین سال، سات سال یا اس سے زائد چرا لینا۔ ہر سال بارہ مہینے کا۔ ہر مہینہ تیس دن کا۔ ہر دن چوبیس گھنٹوں کا۔ بے چارے قیدی کو یہ میعاد کس طرح

ختم ہوتی نظر نہیں آتی ۔ وقت اور دن ان کے لیے چاہے کتنا بھی تیز رفتار ہو لیکن بد قسمت قیدی کے لیے جوں کی چال چلتا ہے ۔

کہا جائے گا کہ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت غم ناک اور قابلِ افسوس صورت حال ہے لیکن بے چارہ جج کیا کرے ؟ کیا وہ اپنے احساسات اور جذبات کے ہاتھوں بِک جائے اور قانون توڑنے والوں کو سزا دینا بند کر دے ؟ اگر وہ اتنا نرم دل اور زود حِس ہے تو وہ اچھا جج کبھی نہیں ہو سکتا اور اسے کسی دوسرے کے لیے جگہ خالی کرنا پڑے گی ۔ نہیں ۔ ججوں سے یہ مطالبہ نہیں ہے ۔ کوئی شخص ججوں سے یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ ہر ملزم کو گلے سے لگائیں اور اس کی کھانے پر دعوت کریں لیکن اگر مقدمہ کرنے اور سزا دینے میں انسانیت کا ایک عنصر بھی شامل ہو جائے تو یقیناً معاملات بہت کچھ روبہ اصلاح ہو جائیں گے ۔ ہمارے جج بہت زیادہ خشک ، بے حس اور جذبات سے مبرّا ہوتے ہیں اور وہ اپنی دی ہوئی سزاؤں کے نتائج کو بھی بہت کم سمجھتے ہیں ۔ اگر کسی طرح ان کا شعور بڑھایا جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ احساس بھی ہونے لگے کہ مجرم بھی ہمارا ہی ایسا ایک انسان ہے تو یہ بہت مفید ثابت ہوگا یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ دونوں قریب قریب ایک ہی طبقے کے ہوں ۔ اگر کوئی امیر ساہوکار جس نے تغلب کیا ہے اور پبلک کا ہزاروں روپیہ کھا گیا ہے قانون کے شکنجے میں پھنستا ہے اور اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے تو جج کو اس سے پوری ہمدردی ہوتی ہے لیکن اس بے چارے بدنصیب پر جس نے کسی فوری ضرورت سے مجبور ہو کر ایک روپیہ چرالیا یا ایک چادر رکھ لی اسے کوئی ترس نہیں آتا ۔ جج اور ایک معمولی ملزم کا ایک ہی طبقے کا ہونا ہر بڑی اصلاح کی طرح موجودہ نظامِ معاشرت میں ایک بڑا زبردست اور بنیادی تغیر پیدا کرنا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس امید میں کہ آئندہ ایسا ہوگا کوئی بہتر صورت یقیناً نکالی جا سکتی ہے ۔

جہاں تک میرا خیال ہے یہ برنارڈ شا BERNARD SHAW ہی نے تجویز کیا تھا کہ ہر جج ، مجسٹریٹ اور جیل کے افسر کو کچھ نہ کچھ زمانہ جیل خانے میں معمولی قیدیوں کی طرح بسر کرنا چاہیے ۔ صرف اسی صورت میں ان کو لوگوں کو سزا دینے یا قید خانوں میں ان پر حکم چلانے کا حق ہو سکتا ہے ۔ تجویز تو نہایت معقول ہے لیکن اس کو عملی جامہ پہناتے

میں مشکلیں ضرور ہیں۔ میں نے ایک دفعہ دبی زبان سے سابق ہوم ممبر صاحب اور صوبہ متحدہ کے جیلوں کے انسپکٹر جنرل صاحب سے اس پر عمل کرنے کی درخواست کی تھی لیکن انھیں یہ بات کچھ پسند نہ آئی۔ کم سے کم ایک مشہور و معروف جیل کے افسر نے اس پر عمل ضرور کیا ہے۔ میرا اشارہ ٹامس ماٹ آسبرن THOMUS MOTT OSBORNE کی طرف ہے جو نیو یارک کے سب سے بڑے جیل خانے سنگ سنگ SINGISNG کا افسر تھا اس نے خود ایک عرصے تک معمولی قیدیوں کی طرح زندگی گزار کر اپنے آپ کو تربیت دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے قیدیوں کی فلاح و بہبودی کے لیے بہت سی ایسی باتیں رائج کیں جن سے ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی ان کے دل و دماغ روشن ہو گئے اور وہ اسی سماج کا ایک رکن بن گئے جس کے دامن پر وہ پہلے ایک بدنما داغ سمجھے جاتے تھے۔

اس طرح اپنی مرضی سے ایک مدت تک جیل خانوں میں رہنا ہمارے ججوں، مجسٹریٹوں اور جیل کے افسروں کو جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے بہت کافی مفید ثابت ہوگا قیدخانہ کی زندگی کے متعلق ان کی واقفیت بھی بڑھ جائے گی اور انھیں اس کا بھی کسی قدر صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ ایک قیدی پر کیا گزرتی ہے اور وہ اپنے دن کس طرح کاٹتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اپنی مرضی سے جیل خانے میں رہنا اور اصلی سزا بھگتنا کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ وہ سزا کی اصلی خلش کبھی محسوس نہیں کر سکتے اور وہ اس بے بسی اور بے چارگی یا اس شکستگی اور مجبوری کی کیفیت کا جو ایک غریب قیدی پر حکومت کی مسلح طاقت کے سامنے دیواروں میں گھر کر طاری ہوتی ہے کوئی اندازہ نہیں کر سکتے اپنی مرضی سے جیل میں رہنے والوں کو کبھی اس بات کا بھی کوئی خوف نہیں ہے کہ جیل کا کوئی افسر چھوٹا یا بڑا ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدسلوکی کرے گا۔ سزا کا وہ نفسیاتی پس منظر بھی (یعنی سماج کا ایک فرد کو ناکارہ سمجھ کر علیحدہ کر دینا یا یوں سمجھیے کہ ایک بیمار عضو قرار دے کر کاٹ ڈالنا) ان کی نظر کے سامنے نہیں آتا تاہم ان تمام خامیوں کے باوجود یہ تجربہ بہت قیمتی ہوگا اور تعزیرات کے نظام اور نفاذ کو بہت کچھ مفید شائستہ اور انسانیت کا حامل بنا دے گا۔ سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریکوں کے دوران میں

درمیانی طبقے کے کثیر التعداد لوگوں نے ہمارے جیل خانوں پر جو دھاوا بول دیا تھا اس کا ایک طور پر کافی اچھا اثر پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ جیل خانے جانے والوں میں سے کوئی نہ توجہ ہوا اور نہ جیل کا افسر اور براہِ راست وہ کوئی اثر نہ ڈال سکا لیکن پھر بھی جیل کے حالات کی واقفیت بہت زیادہ پھیل گئی اور قیدی کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہو گئی اور رائے عامہ اور کچھ کانگریس والوں کا بے غرضانہ جہاد کافی بارآور ثابت ہوا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں ضرورت سے زائد نرم دل ہوں کہ نہیں مگر اپنے نزدیک میں جذبات سے جلد متاثر ہو جانے والا یا رقیق القلب نہیں ہوں۔ میرے قریبی دوست اور بہت سے پرانے ساتھی تو مجھ کو سخت دل سمجھتے ہیں۔ سی۔ آر۔ داس مرحوم نے ایک بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس شخص کا خون سرد ہے۔ شاید ایسی رایوں کا انحصار محض وقتی مقابلے پر یا اپنے جذبات کو ظاہر کرنے یا چھپانے کی قابلیت پر ہوتا ہے۔ بہرصورت اس کی وجہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ محض کسی شخص کو سزا دینے کا خیال ہی میرے دل میں ایک نفرت پیدا کرتا ہے خصوصاً وہ عبرت آموز سزا جس میں کسی کو ستانے کے لیے جان بوجھ کر ظلم اور سختی برتی جاتی ہے۔ غالباً موجودہ دنیا میں اس کو یک قلم مسترد تو نہیں کیا جا سکتا پھر بھی یقیناً اس کی جابرانہ سختی کو بہت کچھ کم کیا جا سکتا ہے اور انسانیت کا عنصر ملا کر اسے بہت کچھ شائستہ بنایا جا سکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا میں سزائے موت کا سخت مخالف تھا اور اصولی طور پر اب بھی اس کے خلاف ہوں۔ لیکن اب میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ موت سے زائد بری بھی کچھ صورتیں ہو سکتی ہیں اور اگر میری ہی پسند پر چھوڑ دیا جائے تو میں غالباً سزائے موت کو حبسِ دوام پر ترجیح دوں گا۔ لیکن پھانسی کے تختے پر چڑھنا میں پسند نہ کروں گا۔ اور اس کے مقابلے میں گولی کھانا۔ سر کٹوانا یا بجلی کی کرسی پر جانا گوارا کر لوں گا۔ سب طریقوں سے زائد میں یہ پسند کروں گا کہ مجھے بھی سقراط کی طرح زہر کا پیالہ دے کر ایسی نیند سلا دیا جائے جس کے بعد کوئی بیداری نہ ہو میری رائے میں سب سے زائد انسانیت اور شائستگی کا طریقہ یہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک پھانسی ہی کا رواج ہے اور پار سال صوبۂ سندھ میں کراچی میں یا کسی اور جگہ منظرِ عام پر

باقاعدہ متعدد پھانسیاں دے کر ہمارے حکام نے ہم پر یہ بخوبی ظاہر کر دیا کہ ان کا دماغ کس ساخت کا ہے۔ غالباً ان کا منشا یہی تھا کہ جو لوگ آئندہ خطا کرنے کی نیت رکھتے ہوں وہ سبق حاصل کریں اور مارے خوف کے اپنے ارادوں سے باز آئیں۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہولناک نظارہ دیکھنے کے لیے ہزاروں آدمیوں کا ایک میلا سا لگا رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو دماغ ایسے مظاہرت عام کے پسِ پشت کارفرما ہے اس کے خدوخال اس ذہنیت سے ایک خاندانی مشابہت رکھتے ہیں جو ہسپانوی مذہبی بازپرس SPANISH INQUISITION کے آتشیں جشن ہائے عقیدت AUTOS-DA-FE کی محرک تھی۔[1]

میرے ایک دوست کو جو اب ہائی کورٹ کے جج ہیں جب پہلے پہل ایک مجرم کو سزائے موت دینا پڑی تو ان کے دل میں ایک زبردست جنگ ہوئی اور ان کے ضمیر پر ایک عجیب کشمکش کا عالم گزرا ان کی طبیعت کسی طرح ایسا کرنا قبول نہ کرتی تھی بہ ہزار مشکل انھوں نے اپنی فطری نفرت اور ہچکچاہٹ پر قابو پایا (ایسا نہ کرتے تو چند ہی روز میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑتا) اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت جلد بلاپس و پیش پھانسی کا حکم سنانے کے عادی ہو گئے۔ وہ غالباً مستثنیات

---

[1] سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جو ظلم اور تشدد مذہب کے نام پر یورپ میں ہوا ہے اس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں مشکل سے ملتی ہے۔ اسپین، فرانس اور اٹلی میں جہاں رومن کیتھلکس کی بے شمار اکثریت تھی مگر کہیں کہیں پروٹسٹنٹ یا کسی دیگر فرقے کے عیسائی اپنے عقائد کی اشاعت کرنے لگے تھے۔ مذہبی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جہاں جن لوگوں کے عقائد مشکوک سمجھے جاتے تھے وہ پکڑ کر لائے جاتے تھے اور ان سے نہایت سختی سے بازپرس کی جاتی تھی۔ ان کے عقائد تبدیل کرنے کے لیے ان پر ہر امکانی تشدد روا سمجھا جاتا تھا تاکہ ان کی روحوں کو عذابِ دوزخ سے بچا لیا جائے لیکن باوجود ان وحشیانہ ظلم و ستم کے جو لوگ اپنے عقائد پر ثابت قدم رہتے تھے ان کو ان عدالتوں سے سزائیں ملتی تھیں۔ عام طور پر حکم یہی ہوتا تھا کہ وہ آگ میں جلا دیے جائیں۔ چنانچہ ان مجرموں کے گروہ کے گروہ سر بازار جلائے جاتے تھے۔ ان فیصلوں کو AUTOS-DA-FE یا احکام شریعت کہتے تھے اور ان کا نفاذ منظرِ عام پر کیا جاتا تھا تاکہ یہ کفر پھیل نہ سکے اور مومنین صحیح عقائد کی یہ حفاظت دیکھ کر خوش ہوں اور جشن منائیں۔

میں سے تھے کیونکہ مجھے اس امر میں بہت بڑا شک ہے کہ عام ججوں کے دل میں جب ایسی نوبت آتی ہے تو کوئی بھی وسوسہ یا تردّد پیدا ہوتا ہے۔

مگر پھانسی لگوانا تو غالباً پھانسی کی سزا دینے سے بھی زیادہ کٹھن کام ہے لیکن اکثر حسّاس افراد بھی اس ہولناک نظارے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ مقامی جیل میں ایک نوجوان انگریز مسولین کے سپرد یہ خدمت ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتلایا کہ پہلی پھانسی کے وقت اس کی بُری حالت ہوئی اور دن بھر اس کی طبیعت مالش کرتی رہی۔ لیکن بہت جلد وہ اس نظارے کا عادی ہو گیا اور کچھ زمانے بعد تو وہ پھانسی لگوا کر سیدھا میز پر جاکر صبح کا کھانا ڈٹ کر کھاتا تھا۔

میں نے خوش قسمتی سے آج تک کوئی پھانسی لگتے نہیں دیکھی ہے۔ زیادہ تر جیل خانوں میں جہاں میں رہا ہوں کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی گئی لیکن تین چار موقع ایسے ضرور آئے۔ یہ پھانسیاں ایک مخصوص محدود احاطے میں دی جاتی تھیں جو الگ اور دور ہوتا تھا لیکن پھر بھی تمام قیدیوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی تھی۔ شاید اس روز بارکوں اور کوٹھریوں کے قفل اور دنوں کے مقابلے میں زیادہ دیر سے کھلنے کی وجہ سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہو۔ میں نے ایسے دنوں میں ایک عجیب کیفیت محسوس کی ہے جیسے کہ ایک منحوس خاموشی طاری ہے اور لوگ دبی آواز میں بات چیت کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سب محض میرے واہمہ کی خیال آرائیاں ہوں۔

لیکن باوجود اس نفرت کے جو میرے دل میں سزائے موت کے خلاف ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان بد سرشت انسانوں کی خباثت کا خاتمہ کرنے کے لیے جن کی زندگی قطعی طور پر سماج کے لیے مضر ہے کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا ہی پڑے گا جس کو بہت احتیاط سے برتا جائے گا۔ سزائے موت یا دیگر سزاؤں کے خلاف جو اصل اعتراض ہے وہ سزا پانے والے کی تکلیف اور مصیبت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے سے اس سماج کی (جو ایسی سزائیں جائز سمجھتی ہے) انسانیت رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی ہے اور وہ درندہ صفت ہو جاتی ہے اور خصوصاً وہ افراد جن کے سپرد اس کے انجام دینے کی خدمت سپرد ہوتی ہے بالکل نیم وحشی ہو جاتے ہیں یہ بات سزائے تازیانہ کی مثالوں میں جو کہ ہندوستان میں بہت عام اور رائج ہے خاص طور پر نظر آتی ہے۔ سزائے تازیانہ کو جائز قرار دینے کے لیے سرکاری صفائی یہ دی جاتی ہے کہ محض ہولناک جرائم مثلاً زنا بالجبر وغیرہ

کے لیے مخصوص ہے مگر عملی طور پر اس کا استعمال بہت زیادہ وسیع ہے اور ۱۹۳۲ء میں (جیساکہ برطانوی پارلیمنٹ میں بتایا گیا) سول نافرمانی کرنے والے پانچ سو قیدیوں کو کوڑے مارے گئے یہ تعداد تو وہ تھی جس کا اندراج سرکاری کتابوں میں موجود تھا اور اس میں وہ سیکڑوں مثالیں موجود نہ تھیں جن کو کہیں لکھا نہ گیا تھا۔ سیاسی قیدیوں کو خالص سیاسی جرائم پر یا جیل کے ضابطے کی قانون شکنی پر یہ کوڑے مارے گئے تھے۔ انھوں نے نہ تو کوئی تشدد کیا تھا اور نہ ان کی خطا مخرب اخلاق یا خلافِ انسانیت تھی۔ عاملانہ قوانین میں اب یہ قاعدہ بھی شامل کیا گیا ہے کہ جیل خانے میں شدید قسم کی فاقہ کشی کرنے والوں کو بھی کوڑے مارے جا سکتے ہیں گویا ہماری برطانوی حکومت کی رائے میں جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے والا یا فاقہ کشی کرنے والا اور زنا بالجبر کا مجرم یکساں ہیں اور ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیل خانوں میں کوڑے مارنے کا کام عام طور پر کسی نیچ ذات قیدی سے لیا جاتا ہے۔ کوئی قیدی اس کام کو پسند نہیں کرتا لیکن یہ خدمت اس سے پوچھ کر اسے نہیں دی جاتی۔ اونچی ذات والے قیدی تو اس صورت میں بھی اس سے انکار کر دیتے ہیں اور اکثر جیل کے ادنیٰ اہلکار اور محافظ بھی اس خدمت سے بچنا چاہتے ہیں۔ ایک وارڈر WARDER نے میرے علم میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس عدول حکمی پر اس کو سزا بھی دی گئی تھی۔ قیدیوں اور جیل کے ادنیٰ اہلکاروں کی اس ذی حسی کا اپنے ججوں، جیل کے افسروں اور اس حکومت کی بے حسی سے مقابلہ کرنا (جو سزائے تازیانہ کی حامی ہے اور اسے جائز قرار دیتی ہے) کافی غور طلب اور سبق آموز ہے۔

حال ہی میں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جو برطانیہ میں فلموں کی نگرانی اور نکتہ چینی CENSORSHIP کے اصولوں کے متعلق تھی۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ فلموں سے کچھ سین کاٹ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں ظلم اور تشدد کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایسے فلموں کو دکھانے کی اجازت نہیں دی جاتی جن میں کسی جانور کے درد یا کرب کو دکھایا جاتا ہے چاہے وہ چوٹ اسے اتفاقیہ پہنچی ہو یا ارادتاً پہنچائی گئی ہو کیونکہ اس کا دیکھنے والوں پر خصوصاً بچوں پر بُرا اثر پڑتا ہے اور ان کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں بھی فلموں کی نگرانی اور نکتہ چینی ہوتی ہے اور جانوروں کو ظلم اور بدسلوکی سے بچانے کے لیے ایک انجمن بھی قائم ہے۔ لیکن یہ بدنصیب دو ٹانگ والے جانور کو یہاں جانوروں میں بھی شمار نہیں کیا جاتا اور وہ اس انجمن کی سرگرمیوں سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور ہماری فلموں کی سنسر شپ فقط اس لیے ہے کہ وہ "کوئٹہ کا زلزلہ" "نیشنل کانگریس کے سین" "مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے روانگی" یا اسی قسم کے دیگر خطرناک فلموں کو ممنوع قرار دے۔

پھانسی یا تازیانہ کی سزائیں ہمارے دلوں کو متاثر کرتی ہیں اور ہم ان کی سختی محسوس کرتے ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ ان ہزاروں بلکہ لاکھوں سزاؤں کا جو ہماری عدالتیں دیتی ہیں محض ایک بہت چھوٹا سا جزو ہیں۔ سزا پانے والوں کی کثیر تعداد تو لمبی لمبی میعادوں کے لیے جیل خانوں میں بند رہتی ہے۔ ان کی زندگی ایک مسلسل کرب اور ایک لامتناہی درد بن جاتی ہے یہاں تک کہ اُن کے جسم سُن پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل و دماغ بے حس ہو جاتے ہیں۔ ہمارا آئین فوجداری اور ہمارے جیل خانوں کے قواعد و ضوابط مل کر قیدی کی مجرمانہ فطرت کو پختہ کر دیتے ہیں اور پھر اس کے بعد ہمارے نظام معاشرت میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ جنسِ ناکارہ کی طرح اس کی کہیں مانگ نہیں ہوتی۔ دنیا سے اس کے کوئی تعلقات باقی نہیں رہتے نہ اس کا کوئی گھر ہوتا ہے نہ زمین۔ ہر ایک کو وہ مشکوک سمجھتا ہے اور خود سب کی نگاہوں میں مشتبہ ہوتا ہے یہاں تک کہ آخرکار وہ گھوم پھر کر جیل خانے میں اپنی جائے قیام پر واپس آجاتا ہے جہاں وہ ٹین یا لوہے کا تسلا جو تنہا اس کا وفادار رفیق تنہائی تھا اسے پھر مل جاتا ہے۔ کیا ہمارے جج کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں کہ ان کی اک ذرا سی جنبشِ قلم کے کیا لازمی نتائج رونما ہوتے ہیں؟ کیا وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ان کی عدالتیں ہی وہ کارخانے ہیں جہاں وہ مجرمانہ ذہنیت تیار ہوتی ہے جس پر جیل خانوں میں پختگی کی مہر لگائی جاتی ہے؟

جیل خانوں میں حکومت کرنے والے گروہ کے ظلم و تشدد اور جبر کا وہ بھیانک آہنی پنجہ جس کے قبضے میں دراصل عنانِ سلطنت ہوتی ہے بالکل صاف نظر آتا ہے کہا جاتا ہے کہ جارج واشنگٹن کا مقولہ تھا "حکومت کی بنیاد تو عقل پر ہے نہ فصاحت پر بلکہ جبر پر جو آگ کی

طرح ایک خطرناک نوکر ہے اور ایک مہیب آقا" یہ صحیح ہے کہ ہمارا ایوان تہذیب ایک دوسرے سے تعاون، ایک دوسرے کا لحاظ اور ہزاروں طریقوں سے آپس میں اشتراک عمل کر کے تعمیر ہوا ہے۔ لیکن جب کبھی کوئی نازک وقت آتا ہے اور حکومت کوئی خطرہ محسوس کرتی ہے اس وقت یہ عمارت منہدم ہو جاتی ہے یا یوں کہیے کہ حکومت کے پہلے اور بنیادی فرض کے تابع ہو جاتی ہے جو ہر امکانی جبر اور تشدّد سے اپنی حفاظت کرتا ہے۔ ایسے زمانے میں افوج، پولیس، جیل خانہ۔ تینوں کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور حکومت کی اصلیت کا چھوٹا سا خاکہ شاید سب میں زیادہ ہولناک عریانی کے ساتھ جیل خانوں میں ہی نظر آتا ہے۔

کیا حکومت کا دار و مدار ہمیشہ جبر اور تشدّد پر ہی رہے گا یا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب یہ عنصر کم ہوتے ہوتے قریب قریب غائب ہو جائے گا۔ ایسا دن اگر وہ آنے والا بھی ہے تو ابھی بہت دور ہے۔ بالفعل تو حکومت کا نظام تشدّد پر قائم ہے اور یہ تشدّد ان گروہوں میں جو اس کو نکالنا چاہتے ہیں ایک جوابی تشدّد پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں اور ان کا ایک ایسا ناقص دائرہ بن گیا ہے جس سے نکلنا دشوار ہے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ دونوں قریب قریب یکساں ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی گنجائش بہت کم ہے۔ مجھے یہ بات ہمیشہ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ وہی حکومت جو خود انتہائی جبر پر مبنی ہے ان گروہوں پر جو اس کے خلاف تشدّد کرتے ہیں انسانیت اور اخلاق کے خون کرنے کا اعتراض کرتی ہے۔ اپنے تحفظ کی بنا پر اس کو یقیناً اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس میں خواہ مخواہ انسانیت اور اخلاق کو کیوں گھسیٹا جاتا ہے؟ حکومت کا تشدّد کچھ صورتوں میں افراد یا چھوٹے گروہوں کے تشدّد سے قابلِ ترجیح ضرور ہے کیونکہ وہ کسی حد تک کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہوتا ہے برخلاف اس کے افراد کا تشدّد بالکل بے ترتیب ہوتا ہے اور تشدّد میں بھی ایک نظام کا قائم رکھنا بدنظمی سے بہتر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس طرح حکومت کی جبر کرنے کی قابلیت اور طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جس وقت حکومت اپنے ہوش و حواس کھو کر اور جامے سے باہر ہو کر اندھے پن کے ساتھ تشدّد پر اتر آتی ہے تب یہ ایسی بھیانک چیز ہو جاتی ہے کہ کسی فرد یا گروہ کا تشدّد اس کی ہولناکی یا وحشیانہ پن کا، بلکہ نہیں

کر سکتا۔

نیٹشے NIETZSEHE کا قول ہے کہ "جب تک زندگی ایک ہیجان اور اضطراب کا کرب نہیں سہتی وہ ایک ہنستا ہوا ستارہ پیدا نہیں کر سکتی" کیا ایسا ہونا لازمی ہے اور اس قانونِ فطرت میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں؟ انسانیت کے شیدا کو قدم قدم پر اس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی طبیعت میں جبر تشدد اور ظلم کے خلاف ایک کراہیت پیدا ہوتی ہے لیکن وہ بجز چپ چاپ کھڑے دیکھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان پر قابو پانا اس کی طاقت سے بعید ہے۔ ارنسٹ ٹالر ERNST TOLLER کی تمثیلوں میں یہی اک خیال بازگشت بن کر گونجتا ہے۔ ؎

انساں کی جہالت کا ابھی ہے وہی معیار
ہے سب سے سوا پختہ دلیل آج بھی تلوار

یا ؎

دکھا سکے گی نہ ہرگز جہاں کو امن کی راہ
ستمگری کی وہ مشعل جو دود سے ہے سیاہ

تاہم دنیا میں ابھی ہر طرف جبر و تشدد ہی کا دور دورہ ہے۔ صرف ہمارے ہی ملک میں تشدد کا طریقہ چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنے کی ایک بلند ہمت اور قابلِ قدر کوشش کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ابھی تاریکیِ فردا میں روپوش ہے لیکن اس کوشش کی وہ والہانہ کیفیت اور ہمارے رہنما کی وہ بے نظیر پاک نفسی اور غیر فانی اولوالعزمی جس نے ہمیں ہماری ذاتی پستی سے اٹھا کر ایک بلندی پر پہنچا دیا ہم میں موجود ہے اور کبھی مٹ نہیں سکتی۔ لیکن یہ تو وہ اہم سوالات ہیں جو ہمارے ججوں کے سلجھائے نہیں سلجھ سکتے۔ ہم شاید ان کا مکمل جواب اپنی زندگی میں بھی حاصل نہ کر سکیں یا اگر کر بھی لیں تو ایک ضدی دنیا کو اس پر عمل کرنے کے لیے راضی نہ کر سکیں تب تک یہ چھوٹے سوالات اور آئے دن کی دشواریاں اور پریشانیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں ہم پلٹ کر پھر انھیں ججوں اور جیل کے افسروں کی طرف آتے ہیں اور کم سے کم اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جان بوجھ کر کسی کو جسمانی اذیت یا دلی کرب پہنچانے سے اس کی اصلاح

نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ مظلوم کی ہمت توڑ دے لیکن یہ اُسے سدھار نہیں سکتا اور اس میں بہت زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ایذا پہنچانے والا وحشی اور مکروہ بن جائے۔ کیونکہ ظلم کی ہوا میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ نہ تو ظالم کو راس آتی ہے اور نہ مظلوم کو بلکہ دونوں کی انسانیت سلب کر لیتی ہے اور انھیں قعرِ بربادی کی تاریک پستیوں میں دھکیل دیتی ہے۔

---

# حقیقت اور حکایت

میری یہ تجویز کہ ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل ایک کانسٹی چوئنٹ اسمبلی CONSTITUENT ASSEMBLY طے کرے ملک میں کافی طور پر پسند کی گئی ہے گاندھی جی نے اسے شرف قبول بخشا ہے اور اسی طرح اور لوگوں نے بھی۔ پھر بھی کچھ حضرات نے میرا مفہوم غلط سمجھا ہے یا یوں کہیے کہ میرا مطلب سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے۔

سیاسی اور قومی خیال سے اگر ایک بار یہ تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا) کہ صرف ہندوستان کے باشندوں ہی کو اپنی قسمت کے فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور ان کو اپنا نظام سلطنت مرتب کرنے کا پورا اختیار ہے تو اس نتیجے پر پہنچنا لازمی ہے کہ یہ محض ایک منتخب شدہ مجلس آئین ساز ہی کر سکتی ہے جس کے نمائندوں کا انتخاب زائد سے زائد افراد کی رائے سے کیا جائے۔ جو لوگ کہ مکمل آزادی کے خواہاں ہیں ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں۔ وہ لوگ بھی جو کہ محض ایک موہوم ڈومنین اسٹیٹس DOMINION STATUS کے طلب گار ہیں ان کو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ فیصلہ ہندوستان کے جمہور ہی کو کرنا ہے اب سوال یہ ہے کہ اس فیصلے پر پہنچنے کی کیا صورت اختیار کی جائے؟ محض افراد یا نام نہاد کے لیڈروں کا کوئی گروہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ آل پارٹیز کانفرنس ALL PARTIES CONFERENCE قسم کی خود ساختہ مجلسیں جن کے افراد زیادہ سے زیادہ کچھ اہل غرض کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کا جمہور سے کوئی تعلق نہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس باوجود اتنی طاقتور اور ایک کثیر التعداد جماعت کی نمائندہ ہونے پر بھی یہ

فیصلہ تنہا نہیں کر سکتی ۔ یہ ضرور ہے کہ اگر جمہور نے کانگریس کا ساتھ دیا تو کانگریس اس مجلسِ آئین ساز پر بہت کچھ قابو پا لے گی ۔ لیکن پھر بھی آخری فیصلہ جمہور کے ہاتھ ہی رہے گا جس کے نمائندوں کے انتخاب سے یہ کانسٹی ٹوئنٹ اسمبلی بنے گی ۔

ظاہر ہے کہ اس مجلسِ شوریٰ کی ان بے روح نقلی کونسلوں اور اسمبلیوں سے جن کو کہ ایک بیرونی طاقت نے جبریہ ہمارے اوپر مسلّط کیا ہے کوئی مشابہت نہ ہوگی ۔ یہ اپنے اختیارات بغیر کسی بیرونی مداخلت کے خود جمہور سے حاصل کرے گی میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اس مجلس کے نمائندوں کے انتخاب میں ہر جوان العمر یا قریب قریب جوان العمر کو رائے دینے کا حق ہونا چاہیے ۔ انتخاب کے طریقے کے متعلق غور کرکے بعد کو بھی تصفیہ کیا جا سکتا ہے ۔ ذاتی طور پر میں اس بات کا حامی ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو یہ انتخاب صیغۂ کار کی بنا پر ہونا چاہیے کیونکہ اصل حقوق کی نمائندگی اس طریقے سے کہیں زیادہ بہتر ہوگی ۔ مقام یا حدود کی بنیاد پر انتخاب کرنے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض اغراض کے نمائندوں کی تعداد زائد ہو جاتی ہے اور بعض حقوق کی پاسداری کرنے والوں کی کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مختلف اغراض کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں دھوکا ہو جاتا ہے ۔ لیکن میں ان میں سے کسی ایک طریقہ پر یا ان دونوں کے مشترکہ استعمال پر راضی ہوں ۔ اس مجلس کا کام محض ایک آئین بنانا ہوگا اور پھر اس نئے آئین کی بنا پر نئے انتخابات ہوں گے مجھے تو ایسی مجلسِ آئین ساز کے انتخاب اور برسر کار ہونے میں صرف ایک بہت بڑی دشواری سدِّ راہ معلوم ہوتی ہے ۔

اور یہ دشواری ایک بیرونی طاقت یعنی حکومتِ برطانیہ کی موجودگی اور دباؤ ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ دباؤ قائم ہے کوئی مجلس آئین ساز صحیح معنوں میں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی لہٰذا سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ قوم میں اتنی سکت آ جائے کہ ہندوستان کے جمہور کی مرضی کو منوا سکے دو متضاد مرضیاں ایک ہی وقت میں کامیاب نہیں ہو سکتیں ۔ ان میں ایک دوسرے پر غالب آنے کے لیے ایک جد و جہد ہونا لازمی ہے اور یہی حال آج ہندوستان کا ہے دراصل یہ تمام جد و جہد برطانوی حقوق اور اغراض کی حفاظت کے لیے اور وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) WHITE PAPER والی تجویز اس بات کی کوشش ہے کہ ان کو

ایک دوامی زندگی مل جائے کوئی مجلس آئین ساز ایسی زنجیروں میں جکڑی نہیں جا سکتی اور جب تک کہ ملک ان زنجیروں کو توڑنے کی طاقت پیدا نہ کرے یہ برسرکار نہیں ہو سکتی۔

یہ مجلس فرقہ وارانہ مسائل بھی طے کرے گی تاکہ کسی اقلیت کے دل میں کوئی شک و شبہہ باقی نہ رہ جائے۔ میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے نمائندوں کو جداگانہ انتخاب سے چنے۔ یہ جداگانہ انتخاب محض مجلسِ آئین ساز ہی کے لیے ہوگا اس کے بعد آئندہ کا طریقہ انتخاب یا اس کے متعلق اور دیگر معاملات یہی مجلس طے کرے گی۔

میں نے اس کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ اگر اس مجلس کے مسلمان نمائندے کچھ فرقہ وارانہ مطالبات پر جمے رہیں گے تو میں اس بات پر زور دوں گا کہ وہ مان لیے جائیں۔ حالانکہ میں فرقہ وارانہ ذہنیت کو بہت ناپسند کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اغراض کا رخ بدلنے یا دلوں سے خوف دور کرنے ہی سے جا سکتی ہے اور محض دبانے سے مٹ نہیں سکتی۔ لہٰذا ہم کو مسلم عوام کے دل و دماغ سے یہ ڈر نکالنا ہے اور انھیں اس بات کا احساس دلانا ہے کہ اگر دراصل وہ کوئی حفاظت چاہتے ہیں تو وہ ان کو ضرور دی جائے گی۔ میرا ایسا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ ذہنیت کو مٹانے کے لیے یہ احساس بہت کافی بااثر ثابت ہوگا۔

لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اس مرض کا اصل علاج یہ ہے کہ عوام کی توجہ ان فرضی روایات سے جو فرقہ وارانہ مسائل کے گرد جمع ہو گئی ہیں ہٹائی جائے اور ان کو موجودہ زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کیا جائے۔ آج کل فرقہ وارانہ ذہنیت کی پشت و پناہ سیاسی رجعت پسندی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر جو لوگ ایسے گروہوں کے لیڈر ہیں وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں رجعت پسند ہیں۔ اوپری طبقے کے چند افراد اپنے طبقے کی مخصوص اغراض کو اس پردے میں چھپاتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے وہ کسی اکثریت یا اقلیت کے مذہبی مطالبات ہیں اگر ہندوؤں، مسلمانوں یا کسی دوسرے فرقے کے مذہبی مطالبات پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ ان مطالبات کا عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ چند بے روزگار پڑھے لکھوں کی نوکریوں کا سوال ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ درمیانی طبقے کی بے روزگاری کا سوال اگر تمام سرکاری نوکریاں ازسرِنو تقسیم بھی کی جائیں تو بھی حل نہیں

ہوسکتا۔ بے روزگاروں کی تعداد، نوکریوں کی تعداد (سرکاری اورغیر سرکاری دونوں) سے بہت زائد ہے۔ اور یہ بہت تیزی سے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کا یاان کی ضروریات کا کسی فرقہ وارانہ مطالبے میں ذکر بھی نہیں ہے۔ غالباً فرقہ پرست ان کو قابل توجہ بھی نہیں سمجھتے۔ کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ کسی مذہبی مطالبے میں کسانوں کی تکالیف اور پریشانیاں دور کرنے کے بارے میں۔ ان کے لگان یا مالگزاری کے متعلق یا قرضے کے اس بھاری اور بھیانک بوجھ کے بارے میں جو انھیں پیسے ڈال رہا ہے کوئی بھی سوال ہے؟ کیا ان میں ریل کے یا دیگر کارخانوں کے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کا جن کی تنخواہیں برابر کاٹی جارہی ہیں اور جن کو زندگی کی ادنیٰ ضروریات پوری کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے کوئی بھی ذکر ہے؟ کیا اس یاس اور نا امیدی پر بھی ان کی نظر ہے جس کی وجہ سے ادنیٰ طبقے کے لوگ پاگل ہوئے جارہے ہیں۔ دلائل کی ساری گرما گرمی ان بحثوں پر جن کے ساتھ صرف چند افراد کی اغراض وابستہ ہیں صرف ہوتی ہے کہ کونسل میں کس فرقہ کو کتنی کرسیاں ملیں۔ مشترکہ انتخاب ہو یا جداگانہ صوبجات کی حدود کیا قائم کیے جائیں اور کون صوبہ علیحدہ کر یا جائے کیا ایک بھوکے کسان کو جس کا فاقوں سے برا حال ہے ان معاملات میں دلچسپی ہو سکتی ہے ؟ لیکن ہمارے فرقہ پرست دوست اس بات کا کافی خیال رکھتے ہیں کہ وہ ان حقیقتوں سے دوچار نہ ہو جائیں تاکہ ان کا حل ان کے اغراض پر اثر نہ ڈالے اور اس وجہ سے وہ عوام کو جھوٹے نزاعات میں الجھائے رکھتے ہیں جو کہ عوام کے مفاد کے خیال سے نہایت حقیر اور دور از کار ہیں۔

فرقہ پرستی کی نفسیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ دراصل ایک تیسرے فریق سے (یعنی حکومت سے) الطاف وعنایات کی بھیک مانگتا ہے۔ ایک فرقہ پرست کا سلسلۂ خیال ایک بیرونی حکومت کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی انتہائی کوشش اور کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص گروہ کے لیے بہترین انعامات حاصل کرے۔ بیرونی حکومت کی موجودگی کو اگر ذہن سے نکال دیا جائے تو اس کا سلسلۂ خیال ٹوٹ جاتا ہے اور اور اس کے تمام دلائل اور مطالبات کی بلند پروازی ختم ہو جاتی ہے۔ بیرونی طاقت اور فرقہ پرست جو کہ محض اوپری طبقے کے چند گروہوں کے نمائندے ہیں حکومت کے سیاسی اور اقتصادی

نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں چاہتے۔ دونوں کی مشترکہ غرض ہے کہ ان کے حاصل شدہ حقوق برقرار رہیں بلکہ ان میں اور اضافہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ان اصلی اقتصادی مسائل کو جو آج ملک کے سامنے پیش ہیں حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے کیونکہ ان کا حل موجودہ تمدن اور معاشرت کو تبدیل کر دے گا اور ان کے بہت سے حقوق زائل ہو جائیں گے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اصل نزاعات کی طرف سے اس طرح نظریں ہٹالینا اور شتر مرغ کی طرح زمین میں سر چھپالینا دونوں کے لیے ایک نہ ایک دن مضر ثابت ہوگا۔ واقعات اور اقتصادی قوتیں حکومتوں اور سلطنتوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہیں اور ان سے بیگانگی برتنا خطرے سے خالی نہیں۔

اس طرح فرقہ پرستی سیاسی اور معاشرتی رجعت پسندی کا ایک دوسرا نام ہو جاتا ہے اور چونکہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ رجعت پسندی کی سب سے بڑی جائے پناہ ہے لہٰذا یہ قدرتی بات ہے کہ وہ ایسے کارآمد اور وفادار معاون کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے۔ ہم کو گمراہ کرنے کے لیے بہت سی الٹی سیدھی باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ ہم کو ہندو معاشرت اور اسلامی تہذیب کا فرق دکھایا جاتا ہے۔ ہماری نظر کے سامنے مذہب پرانے رسم و رواج دیرینہ تاریخی روایات اور اسی قسم کے دیگر اختلافات پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے پردے میں وہی سیاسی اور اخلاقی رجعت پسندی کارفرما ہے لہٰذا فرقہ پرستی کو مٹانے کی ہر امکانی کوشش کرنا چاہیے کیونکہ یہ کسی رعایت کی مستحق نہیں ہے۔ چونکہ فرقہ پرستی کے خد و خال ابھی اچھی طرح سے پہچانے نہیں گئے ہیں اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ یہ جھوٹا رنگ روپ بنا کر سامنے آتی ہے اور اکثر ناواقف لوگ اس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے کانگریسی بھی غیر شعوری طور پر ایک حد تک اس کا شکار بن گئے ہیں اور اپنی وطن پرستی کو اس تنگ اور رجعت پسند عقیدے کے دوش بدوش رکھنے کے کوشاں رہتے ہیں۔ اگر دونوں کی اصلی سرشت کا صحیح اندازہ لگایا جائے تو یہ بہت جلدی واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور ان میں کوئی بات مشترک نہیں ہو سکتی۔ یہ دو مختلف الجنس چیزیں ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ وہ کانگریس والے جو وقتاً فوقتاً ہندو، مسلم، سکھ یا کسی اور فرقہ پرستی سے آنکھیں لڑاتے رہتے ہیں اس بات کو سمجھ لیں اور کسی ایک کو پسند کریں۔ دونوں سے نباہ ناممکن ہے کیونکہ سیاسی اور معاشرتی معاملات میں یا تو

انسان ترقی پسند ہو سکتا ہے یا رجعت پسند۔ کسی قسم کی فرقہ پرستی کے شریکِ عمل ہونے کے معنی یہی ہیں کہ آپ حکومتِ برطانیہ یعنی رجعت پسندی کے بازو کو اور مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیوں کے خلاف ہیں۔ آپ عوام کی سخت اور ناگفتہ بہ تکالیف اور مصیبتوں کا کوئی اثر لینے کو تیار نہیں اور آپ دنیا کے واقعات سے اور رفتارِ زمانہ کی طاقتوں سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرنا چاہتے ہیں۔

فرقہ وارانہ جماعتیں کیا ہیں؟ باوجود اس کے کہ ان کے ارکان سب ایک مذہب کے ہوتے ہیں اور یہ مذہب کے نام کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہ مذہبی انجمنیں نہیں کہی جا سکتیں نہ یہ کسی مخصوص تہذیب و تربیت کی حامی ہیں کیونکہ بجز پرانی تہذیب کی دلچسپ داستانیں سنانے کے انھوں نے تہذیب و تربیت کی ترقی یا تحفظ میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے ان کو اخلاق و اطوار سدھارنے کے ادارے کہنا بھی غلط ہوگا کیونکہ ان کی تعلیم علم الاخلاق سے قطعی طور پر عاری ہے۔ یقیناً یہ اقتصادی مجلسیں نہیں ہیں کیونکہ ان کے افراد کسی اقتصادی کڑی سے ہم رشتہ نہیں ہیں اور نہ ان کا اقتصادی پروگرام ہے ان میں سے کچھ یہ بھی دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ سیاسی جماعتیں نہیں ہیں۔ آخر پھر یہ کون بلا ہیں؟۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ یہ سیاسی طور پر عمل کرتی ہیں اور ان کے مطالبات بھی سیاسی ہیں لیکن اپنے آپ کو غیر سیاسی کہہ کر یہ خود حقیقتوں سے گریز کرتی ہیں اور محض دوسروں کے راستے میں روڑے اٹکایا کرتی ہیں۔ اگر یہ سیاسی انجمنیں ہیں تو ہم کو ان سے یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ ان کا نصب العین کیا ہے۔ کیا وہ ہندوستان کی مکمل آزادی کی حامی ہیں یا محض جزوی آزادی کی (اگر ایسی کوئی چیز ہے) ؟ کیا وہ خود مختاری چاہتی ہیں یا ڈومینین اسٹیٹس DOMINION STATUS؟ بہترین الفاظ بھی بعض وقت دھوکا دیتے ہیں اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مکمل آزادی اور ڈومینین اسٹیٹس میں فقط نام کا فرق ہے۔ دراصل یہ دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں جس طرح کہ دو راہیں دو مختلف رخوں پر جائیں۔ یہ روپے میں چودہ آنے بھر کا سوال نہیں ہے بلکہ دو مختلف قسم کے سکے ہیں جن کا ایک دوسرے سے تبادلہ ناممکن ہے۔

ڈومینین اسٹیٹس چاہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم برطانوی دولت اور اغراض کے آہنی شکنجے

میں جکڑے رہنا چاہتے ہیں کیونکہ ڈومینین اسٹیٹس میں اس گلا گھوٹنے والی گرفت سے کوئی چھٹکارا ممکن نہیں۔ مکمل آزادی میں ان مصیبتوں سے رہا ہونے کی گنجائش ہے اور اس بات کا اختیار ہے کہ ہم اپنا معاشرتی نظام خود بنائیں۔ لہٰذا جو کچھ بھی محدود اختیارات ہم کو ڈومینین اسٹیٹس میں حاصل ہوں گے وہ بینک آف انگلینڈ اور برطانوی سرمائے کے مقدم حقوق سے پابند رہیں گے اور ہمارے لیے موجودہ اقتصادی نظام قائم رکھنا بھی لازمی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنی اقتصادی مشکلات کو حل نہ کرسکیں گے اور عوام کی گردن سے وہ بوجھ جو انھیں پیسے ڈال رہا ہے دور نہ کرسکیں گے بلکہ ہم دلدل میں اور گہرے دھنستے چلے جائیں گے۔ تو پھر فرقہ وارانہ انجمنیں کیا چاہتی ہیں؟ مکمل آزادی یا ڈومینین اسٹیٹس۔

وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) والے آئین (جو کہ ایک آئین کی مضحکہ انگیز نقل ہے) کی طرف ہمیں متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو محض اس بات کی تلخ یاددہانی ہے کہ جب تک حکومتِ برطانیہ میں سکت ہے وہ برطانوی سرمایے اور اغراض کا تحفظ چاہے کوئی بھی جائز حقوق پامال کرنا پڑیں اپنے امکان بھر ضرور کرے گی۔ صرف وہی لوگ جن کا برطانوی اغراض کے تحفظ میں فائدہ ہے یا جو بالکل انیلے اور سیدھے ہیں اس آئین پر نظر ڈالنے کو بھی تیار ہوں گے۔

لیکن اقتصادی نصب العین سیاسی مقصد سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ بات تو شہرۂ آفاق ہے کہ اب سیاست کا وہ مرتبہ نہیں اور جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں اقتصادی طاقتیں قومی نیز بین الاقوامی معاملات پر بخوبی حاوی ہیں۔ فرقہ وارانہ جماعتیں اقتصادی معاملات میں کیا رائے رکھتی ہیں؟ کیا وہ اطمینان کے ساتھ اس فاقہ مستی اور بے روزگاری سے بے خبر ہیں جس نے ہمارے غریب عوام اور کم حیثیت لوگوں کی زندگی کو تیرہ و تار بنا دیا ہے؟ اگر وہ عوام کے نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کروڑوں بے چارے اور بدقسمت غریبوں کے لیے سب سے پہلا اور اہم سوال ان کی فاقہ مستی کا ہے اور ان کے ذہن و دماغ میں کوئی حل (کم سے کم خیالی ہی سہی) اس آفت اور مصیبت کو دور کرنے کے لیے ہونا چاہیے کیا زراعتی اور صنعتی معاملات میں ان کی کوئی تجویز نہیں؟ وہ مزدور اور کسان کی مشکلیں کس طرح حل کرتے ہیں اور زرعی قانون میں وہ کیا تبدیلیاں مناسب سمجھتے ہیں؟ کسانوں کے

قرضے کے بارے میں انھوں نے کیا سوچا ہے ؟ کیا یہ قلمزد کر دیا جائے یا محض کم کر دیا جائے یا بدستور قائم رکھا جائے ؟ بے روزگاری کا کیا حل ہے؟ کیا وہ موجودہ نظام سرمایہ داری کے حامی ہیں یا ان کے ذہن میں کوئی نیا نظام ہے ؟ یہ محض چند سوال ہیں لیکن ان کے جوابات سے فرقہ پرستوں کے دعوؤں اور مطالبات کی پوشیدہ حقیقت فوراً آئینہ ہو جائے گی۔ اور اگر یہ جوابات کسی طرح عوام تک پہنچیں تو سب سے زیادہ ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ مسلم عوام غالباً ہندو عوام کے مقابلے میں زیادہ ہی تباہ حال ہیں۔ لیکن "چودہ شرائط" میں ان غربت زدہ مسلمانوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ہندو فرقہ پرست بھی اپنی اغراض کے تحفظ پر سارا زور دیتے ہیں اور اپنے عوام کی ضروریات کا کوئی خیال نہیں کرتے۔

مجھے ڈر ہے کہ غالباً میرے کسی سوال کا کوئی جواب نہ ملے گا کیونکہ اول تو یہ سوال ذرا ٹیڑھے ہیں اور دوسرے فرقہ پرستوں کے لیڈر اقتصادی معاملات ذرا کم سمجھتے ہیں اور انھوں نے عوام کی بہبودی پیش نظر رکھ کر کبھی سوچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ فقط اس بات میں ماہر ہیں کہ فیصدی ان کا حق کتنا نکلتا ہے۔ ان کا میدانِ کارزار کھیت کارخانہ بازار نہیں ہے بلکہ چھوٹا سا کانفرنس کا کمرہ۔ لیکن چاہے وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ یہ سوالات ایک نہ ایک دن سامنے آئیں گے اور جو لوگ ان کا تشفی بخش جواب نہ دے سکیں گے ان کو عوام الناس اپنے معاملات میں زیادہ دخل نہ دینے دیں گے۔ ہم لوگوں میں سے اکثر ان سب سوالات کا صرف ایک جامع لفظ میں جواب دے سکتے ہیں اور وہ لفظ "سوشلزم" (اشتراکیت) ہے۔ یعنی تمدن کی بنیاد اشتراکیت کے اصولوں پر رکھنا۔

چاہے سوشلزم اور کمیونزم اس کا صحیح جواب ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ جواب محض سیاسی زبان میں نہیں دیا جا سکتا بلکہ لازمی ہے کہ اقتصادی الفاظ میں دیا جائے کیونکہ آج کل دنیا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے اقتصادی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں۔ سیاسی ڈھانچہ چاہے کوئی بھی ہو لیکن جب تک کہ مکمل اقتصادی آزادی ہم کو حاصل نہیں ہوتی ہم حقیقتاً آزاد نہیں ہو سکتے۔ اقتصادی آزادی میں ظاہر ہے کہ سیاسی آزادی شامل ہے۔ آج یہی ایک حقیقت ہے اور اس کے علاوہ باقی سب خواب اور حکایت۔